February 1998 • No. 255 • Rs. 8

اگر آپ سلوک میں دوسروں سے اونچے ہو جائیں تو
دوسرے لوگ کبھی آپ کے ساتھ بدسلوکی کا معاملہ نہیں کر سکتے
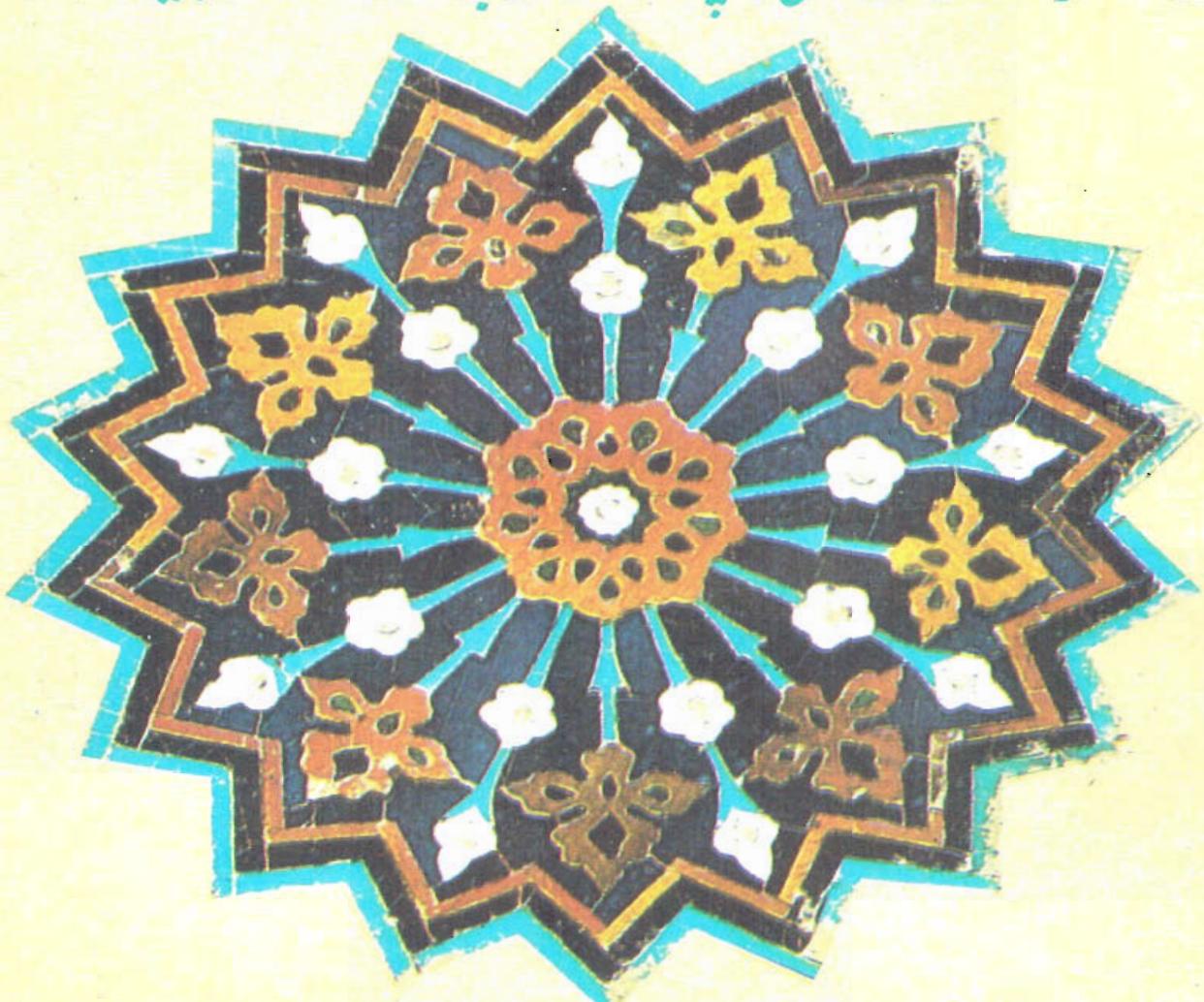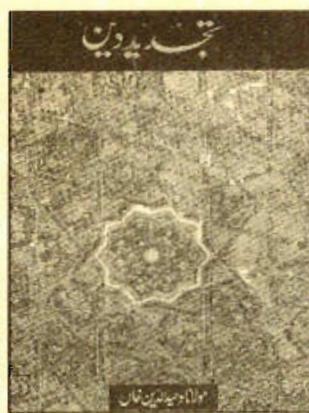
Size 22×14.5cm,
88 pages
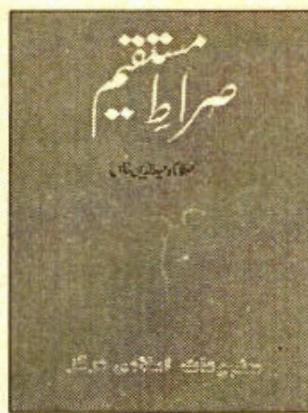
Size 22×14.5cm,
200 pages
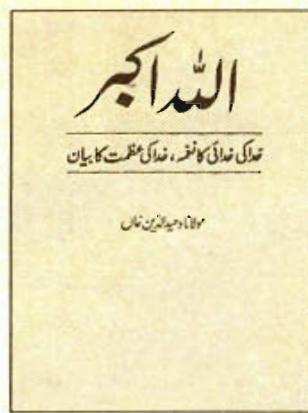
Size 22×14.5cm,
288 pages
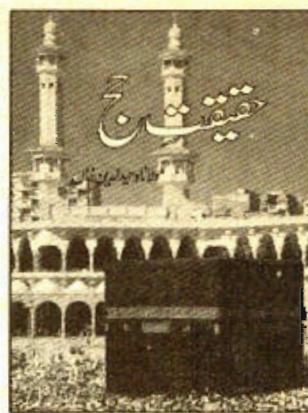
Size 22×14.5cm,
116 pages
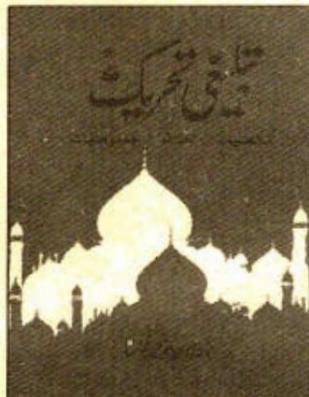
Size 22×14.5cm,
96 pages
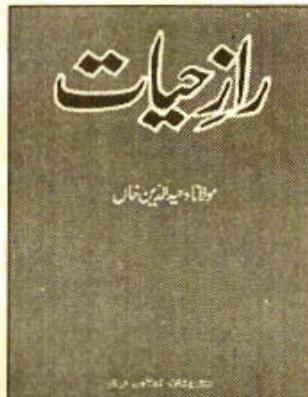
Size 22×14.5cm,
292 pages
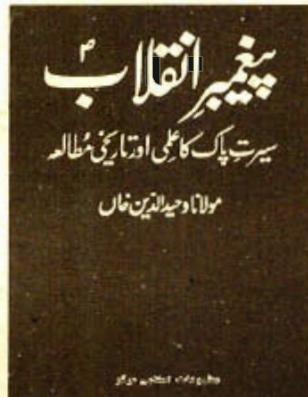
Size 22×14.5cm,
208 pages
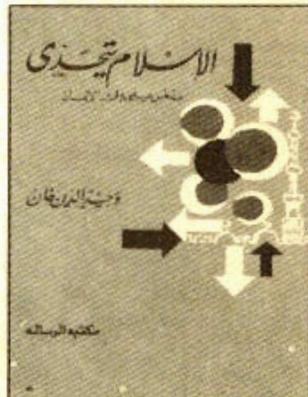
Size 22×14.5cm,
264 pages
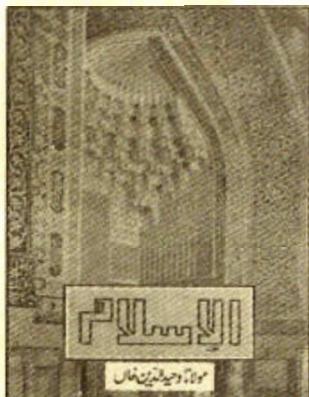
Size 22×14.5cm,
176 pages
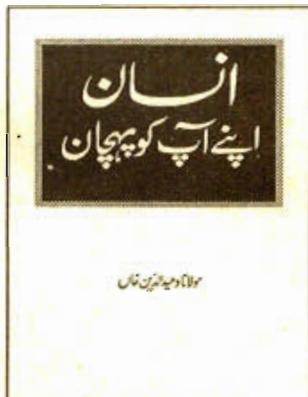
Size 22×14.5cm,
24 pages
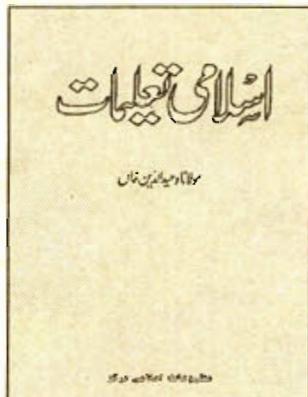
Size 22×14.5cm,
144 pages

Size 22×14.5cm,
160 pages

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز
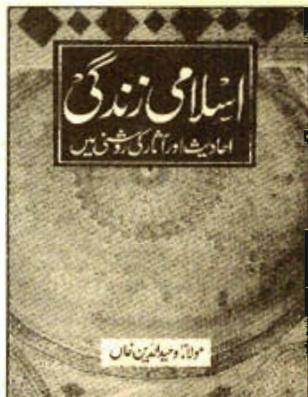
Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

فروری ۱۹۹۸ ، شمارہ ۲۵۵

فہرست — صفحہ

توکل کی حقیقت

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے آپؐ سے توکل علی اللہ کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، میں اپنے اونٹ کو باندھوں اور پھر خدا پر توکل کروں یا اونٹ کو چھوڑ دوں اور پھر توکل کروں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اونٹ کو باندھو اور پھر خدا پر توکل کرو (یارسول اللہ اعقلها و أتوكل أو اطلقها و أتوكل قال اعقلها وتوكل) الترمذی

یہاں یہ سوال ہے کہ اونٹ کو باندھنے کے بعد توکل کیوں۔ بظاہر توکل یہ ہونا چاہیے کہ آدمی اپنے معاملے کی تدبیر نہ کرے، اور یہ بھروسہ رکھے کہ خدا اس کے معاملے کو درست کر دے گا۔ جب آدمی خود ہی اپنے معاملے کی پوری تدبیر کر رہا ہو تو ایسی حالت میں بظاہر خدا پر بھروسہ ایک غیر ضروری امر دکھائی دیتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی کام کی تکمیل کے لیے ہمیشہ دو طرح کے عوامل ہوتے ہیں۔ ایک معلوم عوامل جو انسان کے اپنے بس میں ہوتے ہیں۔ دوسرے، غیر معلوم عوامل، جن کو انسان نہ جانتا ہے اور نہ ان کا اہتمام کر سکتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی واقعہ ہمیشہ ان دونوں قسم کے اسباب کی یکجائی اور موافقت سے انجام پاتا ہے —— اگر ایک نوعیت کے عوامل موجود ہوں اور دوسری نوعیت کے عوامل موجود نہ ہوں تو اس دنیا میں کبھی کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آسکتا۔

مذکورہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے بس والے ظاہری اسباب کو استعمال کرنے میں کمی نہ کرے، وہ اپنی سمجھ اور اپنی طاقت کے مطابق اس کا پورا اہتمام کرے۔ اس اہتمام کے بعد وہ دعا کرے کہ خدایا، جو کچھ میرے بس میں تھا وہ میں نے کر دیا۔ اب جو کچھ میرے بس میں نہیں ہے ان کے لیے تو میری طرف سے کافی ہو جا، بقیہ اسباب جو تیرے اختیار میں ہیں، ان کو بھی تو میری موافقت میں جمع کر دے۔ یہی مطلب ہے اس اسلامی مقولہ کا کہ —— (السعی منی والاتمام من اللہ) (کوشش میری طرف سے، اور اس کو تکمیل تک پہنچانا خدا کی طرف سے)

آدمی خواہ کتنا ہی کوشش کرے پھر بھی کچھ اسباب اس کے دائرہ سے باہر رہتے ہیں۔ آدمی اپنی کوشش میں صرف اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ یہ بقیہ اسباب خدا کی مدد سے اس کے موافق ہو جائیں۔

نیوز ۲۴

بی بی سی لندن نے اپنے ٹی وی پر ایک نیا چینل شروع کیا ہے۔اس کا نام نیوز ۲۴ (News-24) ہے۔ وہ ۲۴ گھنٹہ چلے گا اور رات دن کے ہر لمحہ میں اہلِ برطانیہ کو خبریں فراہم کرتا رہے گا۔

میں نے اس خبر کو پڑھا تو اچانک میرے دماغ میں آیا کہ اسی قسم کا ایک اور زیادہ بڑا ہمہ وقتی چینل ہے جو نہ صرف رات دن چل رہا ہے بلکہ وہ کروروں سال سے جاری ہے۔مزید یہ کہ وہ کسی ایک ملک کو خبریں دینے کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ سارے عالم کو اور تمام انسانی نسلوں کو مسلسل خبریں دے رہا ہے۔

یہ کائناتی ٹی وی وہ ہے جس کو خود کائنات کے خالق نے قائم کیا ہے۔ دنیا کی ہر چیز، پہاڑوں اور سمندروں سے لے کر درخت کے پتوں اور صحرا کے ذروں تک ہر چیز گویا اس کائناتی خبر رسانی کے نظام کا ٹی وی سیٹ ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں ہر لمحہ یہ پیغام دے رہی ہیں کہ یہ کائنات کس لیے پیدا کی گئی ہے۔ انسان کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور انسان کا مستقبل آخر کار کس چیز سے وابستہ ہے۔ پہاڑ اور درخت جیسی چیزیں اگر خاموش زبان میں یہ خبریں دے رہی ہیں تو سمندر کی موجیں اور چڑیوں کے چہچہے اس خبر کو بلند آواز میں نشر کر رہے ہیں۔

انسان کی تخلیق اس ڈھنگ پر ہوئی ہے کہ وہ اس عالمی خبر رسانی سے بھرپور استفادہ کر سکے۔انسان کو آنکھیں اس لیے دی گئی ہیں کہ وہ اس خدائی ٹی وی کے مناظر کو دیکھے۔ انسان کو جو کان دیے گئے ہیں وہ اسی لیے ہیں کہ وہ اس نشریاتی نظام کی آوازوں کو سنے۔ انسان کو دماغ اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ اس مشاہدہ اور سماعت کا تجزیہ کر کے ان سے سبق حاصل کرے۔ انسان کو دل اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ ان ربانی خبروں پر تڑپے۔ انسان کو ہاتھ اور پاؤں اس لیے دیے گئے ہیں کہ وہ ان خبروں کے مطابق ہمہ تن متحرک ہو جائے۔

جنت ان لوگوں کے لیے ہے جو خدائی خبر رسانی کے اس عالمی نظام سے رہنمائی حاصل کریں۔ اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنالیں۔ اس کے برعکس جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو اس رہنمائی کو لینے میں ناکام رہیں۔ ایسے لوگ گویا کہ اندھے اور بہرے ہیں۔ وہ مستقبل کی ابدی زندگی میں بھی اندھے اور بہرے بنے رہیں گے۔

وَن مَین ٹو مشن

۸ دسمبر ۱۹۹۷ کو مسٹر مقصود عالم (پیدائش ۱۹۳۶) سے ملاقات ہوئی۔ وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں اور دہلی میں پریکٹس کرتے ہیں۔ اپنی دیانت اور مہارت کی بنا پر وہ لوگوں کے درمیان ایک مقبول شخصیت بن گئے ہیں۔ میرا طریقہ ہے کہ جب میں کسی سے ملتا ہوں تو اس سے یہ کہتا ہوں کہ اپنی زندگی کے تجربات بتائیے۔ چنانچہ مسٹر مقصود عالم سے بھی میں نے یہی سوال کیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کئی تجربات بتائے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ اس انسان کی ایک کامیاب مثال ہیں جس کو خود انھیں کے الفاظ میں ایک آدمی، دو مشن (one man, two mission) کہا جاسکتا ہے۔

اپنے مشن میں دیانت دارانہ خدمت کی وجہ سے وہ دہلی کے اعلیٰ طبقوں میں ایک قابل اعتماد شخص بن گئے ہیں۔ ان کی بات کو لوگ سنتے ہیں اور مانتے ہیں۔ اپنی اس پوزیشن کا وہ یہ مزید فائدہ اٹھا رہے ہیں کہ وہ مذہبی اور رفاہی اور تعلیمی اداروں کی رضا کارانہ خدمت کر رہے ہیں۔ وہ ان اداروں کو نہ صرف مفید قانونی مشورے دیتے ہیں بلکہ ان اداروں کو صاحب حیثیت افراد سے مسلسل تعاون دلاتے رہتے ہیں۔ ان کے کہنے پر یہ لوگ خوشی سے ان اداروں کو تعاون دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جب مقصود عالم صاحب ان کے لیے سفارش کر رہے ہیں تو وہ ضرور ایسا ادارہ ہوگا جس کی مدد کی جائے۔

یہ بلاشبہ ایک قابل تقلید مثال ہے۔ ہمارے درمیان ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو "وَن مَین ٹو مشن" کا یہ رول ادا کرنے کے اہل ہیں۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ ایک طرف وہ اپنی معاش کے لیے اپنا پسندیدہ کام کریں، دوسری طرف وہ یہ کریں کہ اپنی حاصل کردہ پوزیشن کو اس مقصد کے لیے استعمال کریں کہ اپنے حلقہ میں لوگوں کو آمادہ کریں کہ وہ ان اداروں کا تعاون کریں جو مختلف میدان میں انسانیت کی کوئی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح ہر آدمی بیک وقت دو کردار ادا کر سکتا ہے۔ ایک طرف وہ اپنی معاشی ضرورت فراہم کرے، اسی کے ساتھ وہ دوسروں کی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ بن جائے۔

تعمیر ملت کا بہترین پروگرام یہ ہے کہ ہر آدمی وَن مَین ٹو مشن کا نمونہ بن جائے۔

مغربی تہذیب اور اسلام

صحیح البخاری میں روایت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ان اللہ لیؤید هذا الدین بالرجل الفاجر (اللہ اس دین کی مدد فاجر wicked شخص سے بھی کرے گا) یہ حدیث آرٹ آف تھنکنگ کے اعتبار سے بےحد اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) کی غلطی کو بتاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان صرف دو کیٹگری ـــــ صالح اور فاجر میں تقسیم نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کی ایک تیسری قسم بھی ہے، اور وہ مؤید (supporter) کی ہے۔ یعنی ایک انسان بظاہر صالح نہیں ہے، بظاہر وہ فاجر دکھائی دیتا ہے۔ تب بھی یقینی طور پر اس کے اندر ایک تیسری صفت ہوسکتی ہے، اور وہ یہ کہ وہ کسی اعتبار سے ہمارے لیے تائید (support) کا ذریعہ بن جائے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں حدیبیہ اسی غیر ثنائی طرز فکر کی ایک عملی مثال ہے۔ ظاہری حالات کے اعتبار سے حدیبیہ کا فریق مقابل اسلام دوست نہ تھا، اس لیے لوگوں نے اپنے ثنائی ذہن کے مطابق یہ سمجھ لیا کہ وہ اسلام دشمن ہے۔ مگر پیغمبر اسلام اپنی ربانی فراست (وزڈم) کی بنا پر اس dichotomy کا شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے دریافت کرلیا کہ یہاں ایک تیسری صورت بھی موجود ہے۔ اور وہ خود فریق مخالف میں دعوت کے چھپے ہوئے امکانات ہیں۔ چنانچہ آپ نے فریق ثانی سے امن کا معاہدہ کرکے دعوت کے امکانات کو کھول دیا۔ اس کے بعد موافق ماحول میں دعوت کے امکانات استعمال ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو سال میں اسلام کی تاریخ بدل گئی۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں مغربی تہذیب کا معاملہ بھی عین یہی ہے۔ آج دوبارہ مسلمان اسی معاملہ میں اسی قسم کی dichotomy کا شکار ہو رہے ہیں۔ چوں کہ بظاہر مغربی تہذیب انھیں اسلام دوست دکھائی نہیں دیتی اس لیے ثنائی طرز فکر کی بنا پر وہ سمجھ لیتے ہیں کہ مغربی تہذیب اسلام کی دشمن ہے۔ حتی کہ کچھ انتہا پسند (extremists) اس کو دجال بتا رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس dichotomy سے باہر آجائیں تو معلوم ہوگا کہ مغربی تہذیب اگر اسلام دوست نہیں تو وہ اسلام دشمن بھی نہیں۔ بلکہ حدیث کی زبان میں وہ اسلام کی معاون (supporter) ہے۔

آج دوبارہ اسی مومنانہ فراست (divine wisdom) کی ضرورت ہے جو حدیبیہ کے موقع پر اختیار کی گئی۔ اگر ہم ایسا کر سکیں تو دوبارہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی۔ ناموافق صورت حال میں موافق حالات برآمد ہو جائیں گے اور ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ان چھپے ہوئے موافق امکانات کو استعمال کر کے اسلام کی نئی تاریخ بنا سکیں۔

مغربی تہذیب کے علم بردار اپنے سیاسی اور اقتصادی انٹرسٹ کے تحت بہت سی ایسی کارروائیاں کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک ہمارے ملی انٹرسٹ کے خلاف ہوتی ہیں۔ بطور واقعہ میں اس بات کو درست مانتا ہوں۔ مگر اس کا تعلق حقیقۃً اسلام دشمنی سے نہیں ہے۔ یہ تمام تر کامپٹیشن کا معاملہ ہے۔ یہ دنیا کامپٹیشن کے اصول پر بنائی گئی ہے، اس لیے اس قسم کے واقعات یہاں ہمیشہ جاری رہتے ہیں اور جاری رہیں گے۔ ہمیں چاہیے کہ ان کو فطرت کا تقاضا قرار دیتے ہوئے اپنی ساری توجہ اُن امکانات کی تلاش اور ان کو استعمال کرنے میں لگا دیں جو بظاہر مخالف حالات کے باوجود ہمارے لیے یہاں پوری طرح موجود ہیں۔

دجال کی حدیث بذاتِ خود صحیح ہے۔ مگر جہاں تک جدید مغربی تہذیب کا تعلق ہے وہ یقینی طور پر حدیث دجال کے تحت نہیں آتی۔ مغربی تہذیب کا معاملہ زیادہ صحیح طور پر اُس دوسری حدیث سے تعلق رکھتا ہے جو ادخالُ الکلمہ کی نسبت سے بطور پیشین گوئی وارد ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب ادخال الکلمہ کی خدائی اسکیم کے لیے ایک معاون عامل (supporting factor) بن کر ابھری ہے۔ دجال والی حدیث سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔

مذکورہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ اسلام کا کلمہ ساری دنیا کے ہر چھوٹے اور بڑے گھر کے اندر داخل ہو جائے گا۔ غور کیجئے تو موجودہ اسباب کی دنیا میں اس پیشین گوئی کو عملی طور پر واقعہ بنانے کے لیے بہت سے معاون ذرائع درکار تھے۔ یہ معاون ذرائع پچھلے زمانہ میں موجود نہ تھے۔ یہ صرف جدید مغربی تہذیب ہے جس نے تاریخ میں پہلی بار ان تمام وسائل و ذرائع کو مکمل طور پر مہیا کر دیا ہے جو ادخال الکلمہ کے عمل کی تکمیل کے لیے ضروری تھے۔

اس طرح حدیث کے الفاظ میں، مغربی تہذیب کا کیس نہ دوست کا کیس ہے اور نہ دشمن کا کیس، بلکہ اس کا کیس تیسرا ہے، اور وہ موید (سپورٹر) کا کیس ہے۔ اس معاملہ کی عملی وضاحت کے

سیلے اس نوعیت کی کچھ تائیدی چیزیں مختصر طور پر بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۔ ادخالُ الکلمہ کے لیے سب سے پہلی ضروری چیز جو درکار تھی وہ کمیونی کیشن کے عالمی ذرائع ہیں۔ اور یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ مغرب کا لایا ہوا تہذیبی انقلاب انسانی تاریخ کا وہ پہلا واقعہ ہے جس نے اس قسم کے عالمی کمیونی کیشن کو ہماری دسترس میں دے دیا جو اس عمل کی تکمیل کے لیے ناگزیر طور پر درکار تھا۔

۲۔ دوسری لازمی ضرورت کھلی مذہبی آزادی تھی۔ اگر مذہبی آزادی نہ ہو تو مطلوب نوعیت کی کامیاب عالمی پیغام رسانی ممکن نہیں۔ یہ بھی مغربی تہذیب ہی کی دین ہے کہ اس نے ایک ایسا دور پیدا کیا جہاں تاریخ میں پہلی بار مذہبی آزادی کو انسان کے مقدس حق کے طور پر مان لیا گیا۔

۳۔ ادخالُ الکلمہ کی اسکیم کو عالمی سطح پر مکمل کرنے کے لیے بے پناہ دولت درکار تھی۔ یہ چیز بھی مغربی تہذیب ہی کے ذریعہ بالواسطہ طور پر مسلم ملکوں کو حاصل ہوئی ہے۔ یہ مغربی تہذیب ہی کے حاملین تھے جنھوں نے مسلم ملکوں میں پٹرول کی دولت دریافت کی۔ پھر یہی لوگ ہیں جنھوں نے جدید مشینی دور پیدا کر کے اس پٹرول کو قیمتی (commodity) کی حیثیت دے دی۔ اس طرح سے حاصل شدہ دولت نے مسلمانوں کو آج اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ ادخالُ الکلمہ کی عالمی مہم کی بڑی سے بڑی قیمت دے کر اسے جاری رکھ سکیں۔

۴۔ مغربی تہذیب کے ذریعہ حاصل شدہ تائیدوں میں سے ایک تائید یہ ہے کہ اس نے پہلی بار فری انکوائری کے اصول کو کامیابی کے ساتھ مقدس کتابوں تک وسیع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری تمام مذہبی کتابیں غیر تاریخی ثابت ہوگئیں۔ اب استثنائی طور پر صرف قرآن ایک تاریخی طور پر ثابت شدہ کتاب کی حیثیت سے باقی رہا۔ اس طرح مغربی تہذیب کے پیدا کردہ علمی انقلاب نے اسلام کو عملی کے درجہ میں مذہب کا واحد قابل اعتبار نمائندہ بنا دیا۔

۵۔ پھر یہ مغربی تہذیب ہی ہے جس نے فطرت کے چھپے ہوئے رازوں کو دریافت کیا جو کہ قرآن کی سچائی کی تصدیق کرنے والے تھے۔ اس طرح مغربی تہذیب ہی کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے قرآن کی اس آیت کی سائنسی تفسیر لکھی کہ —— ہم انھیں آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ یہ حق ہے (41:53)

مغربی تہذیب کے حاملین کے ذریعہ عالم فطرت کے بے شمار نئے حقائق سامنے آئے ہیں جو کہ اسلام کی صداقت کو خالص علمی بنیادوں پر درست ثابت کر رہے ہیں۔

مذکورہ اسباب کی بنا پر میری قطعی رائے ہے کہ مغربی تہذیب دجال کا ظہور نہیں، اپنے امکانات کے اعتبار سے وہ اسلام کے حق میں تائیدالٰہی کا ظہور ہے۔ اس نے وہ تمام اسباب پیدا کر دیے ہیں جو ادخالُ الکلمہ کی مہم کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ان امکانات کو استعمال کرتے ہوئے یہ کام بخوبی طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔

یہ پراسس بالفعل شروع ہو چکا ہے۔ آج ہر دن ہزاروں لوگ اسلام کو دین فطرت پا کر اس کو قبول کر رہے ہیں۔ حدیبیہ کا معاملہ طے ہونے کے بعد قرآن کی سورہ الفتح اتری تھی اس میں کہا گیا کہ:

> that it may be a sign for the believers, and that He may guide you to a straight path. (48:20)

دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ معاملہ اس لیے ہوا تا کہ تم کو ایک علامتی واقعہ کی صورت میں بتایا جائے کہ اس طرح کے معاملات میں تم dichotomy میں گرفتار نہ ہو بلکہ تیسرا راستہ تلاش کرو۔ یہ حدیبیہ پرنسپل ہے اور مغربی تہذیب کے معاملہ میں ہمیں اسی حدیبیہ پرنسپل کو اختیار کرنا ہے۔ اس کے بعد خدا کی یہ بشارت ہمارے اوپر صادق آئے گی کہ ہم نے تم کو کھلی فتح دے دی (48:1)

ایک سنّت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اہل اسلام کے لئے ایک معیاری نمونہ ہے۔ اس سنت کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے، خواہ وہ مسواک جیسا انفرادی معاملہ ہو یا جہاد جیسا اجتماعی معاملہ۔ خواہ وہ آج کا مسئلہ ہو یا ہزاروں برس بعد کا کوئی مسئلہ۔

سنت کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک سنت وہ ہے جو اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے مطلوب ہوتی ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ صلّوا کما رأیتمونی أصلّی (مشکوٰۃ المصابیح ، ۱/۲۱۵) اس حدیث کا تعلق اصلاً نماز کی ظاہری صورت (form) سے ہے۔ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور خود بھی اسی طرح نماز ادا کی۔ اسی طرح اس کے بعد صحابہ کو دیکھ کر تابعین نے اور تابعین کو دیکھ کر تبع تابعین نے نماز پڑھی۔ یہ سلسلہ نسل در نسل امت میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ آج ہم جو نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی بالواسطہ طور پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی نقل ہوتی ہے۔

اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے اونٹ پر بیٹھ کر حج کے مراسم ادا کئے تاکہ لوگ آپ کو دیکھ سکیں۔ اس وقت آپ نے فرمایا کہ اے لوگو، مجھ کو حج کرتے ہوئے دیکھو اور اسی کے مطابق تم حج کے مناسک ادا کرو (خذوا عنّی مناسککم)

یہ سنت کی پہلی قسم ہے۔ اس میں یہ مطلوب ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی فعل کو جس شکل میں کیا ہے، عین اسی شکل میں اس کو ادا کیا جائے۔ اس کو سنت ظاہری کہا جا سکتا ہے۔

دوسری سنت سنتِ معنوی ہے۔ یعنی وہ سنت جو اپنی روح (اسپرٹ) کے اعتبار سے مطلوب ہوتی ہے. اس دوسری سنت میں ظاہری شکل اضافی ہے، اور اس کی معنوی روح حقیقی اور اصل مطلوب کی حیثیت رکھتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن ۲۳ سال کے عرصہ میں اترا۔ جب بھی قرآن کا کوئی حصہ اترتا تو اسی وقت آپ کسی کاتب کو بلا کر اس کو لکھواتے۔ آپ کی خدمت میں ہر وقت کوئی نہ کوئی کاتب موجود رہتا۔ اس طرح کاتبان وحی کی تعداد ۴۰ سے زیادہ شمار کی گئی ہے۔ آپ کو اس کا اتنا زیادہ اہتمام

تھا کہ ہجرت کے نازک سفر میں بھی قلم اور کاغذ آپ کے ہمراہ تھا اور ایک کاتب وحی (ابوبکر صدیق) آپ کے ساتھ چل رہے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پورا قرآن اس زمانہ کے اوراق اور کاغذات پر لکھا جا چکا تھا۔ بہت سے صحابہ (مثلاً زید بن ثابت انصاری) پورے قرآن کے حافظ تھے۔ آخر عمر میں آپ نے ایک بار پورے قرآن کو سلسلہ وار پڑھا اور صحابہ کی ایک جماعت نے اس کو براہ راست آپ سے سنا۔ اس کو حدیث کی کتابوں میں العرضۃ الاخیرۃ کہا گیا ہے۔

اس طرح کے مختلف اہتمام کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو ایک جلد کی صورت میں جمع نہیں فرمایا۔ آپ کی وفات کے وقت قرآن یا تو لوگوں کے سینہ میں تھا، یا متفرق ٹکڑوں اور اوراق پر لکھا ہوا تھا۔ وہ ایک واحد کتاب کی صورت میں مرتب نہیں ہوا تھا جیسا کہ آج وہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقینی طور پر اس سے باخبر تھے کہ اس صورت حال کو بعد کے لوگ کتاب اللہ کے بارے میں شوشے بنائیں گے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں مستشرقین نے اس واقعہ کو لے کر طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر مستشرقین کی مرتب کردہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) کی پانچویں جلد میں اس مسئلہ کو اٹھایا گیا ہے اور اس کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک توجیہہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کا خیال تھا کہ قیامت کا وقت قریب آگیا ہے اور جلد ہی یہ دنیا ختم ہو جائے گی، اس لئے قرآن کو ایک جلد میں مرتب کرنے کا جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوا:

ان الرسول کان یتوقع قرب قیام الساعۃ ونهایۃ العالم فی زمن قریب۔ فکان لہ داعی الی جمع القرآن (الوعی الاسلامی، کویت، رمضان ۱۴۱۰ھ)

ان امکانی خطرات کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل کہ آپ نے قرآن کو ایک صحیفہ کی صورت میں مجلد نہیں کرایا، یہ کوئی بھول یا غلطی کی بات نہیں ہے، یہ خود آپ کی ایک سنت ہے۔ ایسا آپ نے قصد و ارادہ کے تحت کیا۔ کیوں کہ اس سے ایک اہم دینی فائدہ وابستہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن دین کو کامل کرنا تھا، اس لئے ناممکن تھا کہ آپ کسی دینی کام کو غیر کامل حالت میں

چھوڑ دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ایسا کرتے کہ اپنی زندگی ہی میں قرآن کو ایک صحیفہ کی صورت میں مرتب کر کے اس کی بہت سی جلدیں بنواتے اور اس کو تمام ملکوں کی مسجدوں میں رکھوا دیتے تو آپ کے بعد قرآن کا تقریباً وہی انجام ہوتا جو آج امت کے اندر نظر آ رہا ہے۔ لوگ بنے بنائے قرآن کو لے کر بس اس کی تلاوت کرنے میں لگ جاتے۔ قرآن کے سلسلہ میں انھیں اس کے سوا کوئی اور کام نظر نہ آتا جس میں وہ اپنے آپ کو مشغول کریں۔ قرآن کی تدوین کو ناتمام چھوڑ کر آپ نے اپنے بعد امت کو ایک بہت بڑی مشغولیت عطا کر دی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ میں ۱۲ ھ میں یمامہ (سعودی عرب) میں ایک جنگ ہوئی۔ اس میں ۷۰ ایسے مسلمان شہید ہو گئے جو پورے قرآن کے حافظ تھے۔ اس سے حضرت عمر فاروق کو اندیشہ ہوا کہ قرآن کے حافظ اگر اسی طرح ختم ہوتے رہے تو قرآن کا علم چلا جائے گا۔ انھوں نے حضرت ابوبکر سے کہہ کر قرآن کی تدوین کرائی۔

تاہم یہ کوئی سادہ معاملہ نہ تھا۔ اولاً خلیفہ اول کو اس میں تردد ہوا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ اس کو ہم کیسے کریں۔ کافی بحث کے بعد وہ راضی ہوئے۔ اب ایک مستقل سرگرمی جاری ہوگی۔ مثلاً حضرت عمر اور حضرت زید روزانہ مسجد کے دروازہ پر بیٹھ جاتے اور لوگوں سے کہتے کہ جس کے پاس قرآن کا کوئی حصہ لکھا ہوا موجود ہو، وہ یہاں لا کر مسجد میں جمع کرے۔

حضرت زید بن ثابت انصاری اپنی مختلف صلاحیتوں کی وجہ سے اس کے لئے موزوں سمجھے گئے کہ وہ اس عظیم کام کے ذمہ دار اعلیٰ مقرر کئے جائیں۔ انھوں نے تمام جمع شدہ مکتوب اجزاء کو پڑھا۔ ان کو حافظہ کی مدد سے جانچا۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار کسی کتاب کے لئے (double checking) (دہرا جانچ) کا نظام قائم کیا گیا۔ یعنی کتابت کو حافظہ سے جانچا گیا اور حافظہ کو کتابت سے۔ تاہم حضرت زید بن ثابت (م ۴۵ ھ) کے لئے یہ اتنا سخت کام تھا کہ انھوں نے کہا:

فو اللہ لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان اثقل علیّ مما امرنی بہ من جمع القرآن (المصاحف لابن ابی داؤد)	خدا کی قسم، اگر وہ مجھ پر یہ ذمہ داری ڈالتے کہ پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کو میں اپنی جگہ سے ہٹا دوں تو وہ میرے لئے اس حکم سے زیادہ سخت نہ ہوتا جو ابوبکر و عمر

نے قرآن کو جمع کرنے کے لئے مجھے دیا۔

ایک سرگرم اور پر از واقعات جد وجہد کے بعد جب قرآن ایک کتاب کی صورت میں مدون ہوگیا تو اب یہ سوال تھا کہ کثیر تعداد میں جو لکھے ہوئے اجزاء جمع ہوئے ہیں، ان کو کیا کیا جائے۔ اب دوبارہ بحث شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ متفقہ فیصلہ کے تحت ان سب کو جلا کر ختم کر دیا گیا۔

یہ لمبا طرح طرح کے واقعات سے بھرا ہوا کام جس کی تفصیل کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کو ایک نئی زبردست مشغولیت دے دی۔ اس مشغولیت کے دوران ان کے اوپر دین کے بہت سے نئے نئے پہلو واضح ہوئے۔ حتی کہ انھوں نے قرآن کو ازسرنو دریافت (rediscover) کیا۔ انھوں نے قرآن کے ساتھ ازسرنو اپنے زندہ تعلق کو استوار کیا۔ قرآن ان کے لئے محض ایک تقلیدی کتاب نہ رہا، بلکہ ایک ایسی کتاب بن گیا جس کو انھوں نے گویا اپنی تلاش اور محنت کے دوران دوبارہ نئے شعور کے ساتھ دریافت کیا تھا۔

یہ سنت جس کو ہم نے سمجھنے کی خاطر معنوی سنت کا نام دیا ہے، وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ جس طرح آپ کی دوسری سنتیں ہمیشہ کے لئے مطلوب ہیں، اسی طرح یہ معنوی سنت بھی ہمیشہ کے لئے مطلوب ہے۔ مزید یہ کہ وہ بے حد اہم سنت ہے، کیوں کہ اسی کے ذریعہ سے امت کا احیاء ہوتا ہے۔ وہ امت کے افراد کو مسلسل طور پر زندہ اور سرگرم عمل رکھنے کا سب سے زیادہ طاقت ور ذریعہ ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالی نے اس لئے اتاری ہے کہ اس کے ذریعہ سے تمام دنیا والوں کو آگاہ کیا جائے (الفرقان ۱) جیسا کہ معلوم ہے، قرآن عربی زبان میں ہے، جب کہ دنیا کی قوموں میں ہزاروں مختلف زبانیں رائج ہیں۔ ایسی حالت میں تمام قومیں کس طرح قرآن سے آگاہی لے سکتی ہیں۔

اگر اللہ تعالی کو یہ مطلوب ہوتا کہ ہر قوم براہ راست اسی منزّل قرآن سے ہدایت حاصل کرے تو وہ قرآن کو کسی بین اقوامی زبان (Lingua franca) میں اتارتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اللہ تعالی کو یہ مطلوب ہے کہ مومنین قرآن اس کتاب کو تمام قوموں کی زبانوں میں ترجمہ کریں اور اس طرح اس کو تمام لوگوں تک ان کی قابل فہم صورت میں پہنچائیں۔

یہ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معنوی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو موجودہ زمانہ میں ضرورت تھی کہ اس سنت نبوی پر عمل کیا جاتا۔ مثلاً اس کی ایک صورت یہ تھی کہ موجودہ زمانہ میں پریس کی ایجاد اور مواصلات کے جدید ذرائع کے ظہور نے اس کا امکان پیدا کر دیا تھا کہ قرآن کو بآسانی تمام قوموں کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ اب اگر ہمارے رہنماؤں نے اس سنت کو زندہ کیا ہوتا۔ اور وہ قوم کو ابھارتے کہ قرآن کا ہر زبان میں مستند ترجمہ کرو۔ اس کو چھپواؤ۔ اور اس کو ساری دنیا میں پہنچاؤ تو یہ اتنا بڑا کام ہوتا کہ امت پوری کی پوری اس کام میں مشغول ہو جاتی۔ اس رخ پر عمل شروع کرنے کے بعد اس کے بے شمار پہلو نکلتے۔ ہر آدمی اس میں اپنے لئے کرنے کا کام پالیتا۔

اس طرح گویا مسلمان قرآن کو موجودہ زمانہ کے لحاظ سے ازسرنو دریافت (rediscover) کرتے۔ قرآن دوبارہ ان کے لئے ایک زندہ کتاب بن جاتا جو ان کی پوری زندگی میں دینی بھونچال پیدا کر دیتا۔ مگر بروقت اس قسم کی رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے پوری ملت سیاست کی چٹان پر بے فائدہ طور پر اپنا سر پٹک رہی ہے اور نتیجۃً دین سے بھی محروم ہے اور دنیا سے بھی۔

موجودہ زمانہ میں اس غلطی پر مزید اضافہ یہ کیا گیا ہے کہ غیر دعوتی کام کو دعوت کا نام دے دیا گیا ہے۔ کوئی مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کو دعوت کہہ رہا ہے۔ کوئی مسجد اور مدرسہ بنانے کو دعوت کا کام سمجھ رہا ہے۔ کوئی مفروضہ دشمنان اسلام کے خلاف جنگ چھیڑتا ہے اور اس کو دعوت کا نام دے دیتا ہے۔ کوئی دوسرے مذہب کے لوگوں سے مناظرہ بازی کرتا ہے اور اس کو دعوت کا عمل قرار دے رہا ہے۔ کوئی اسلامی سیاست کا ہنگامہ کھڑا کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ یہی دعوت کا اصل کام ہے۔

اس قسم کی ہر کوشش ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہے۔ دعوت الی اللہ ایک متعین عمل کا نام ہے، اور وہ ہے، خدا کے دین کو اس کی بے آمیز صورت میں غیر مسلموں تک پہنچانا۔ یہ وہی کام ہے جس کو قرآن میں انذار و تبشیر کا عنوان دیا گیا ہے۔ یہ ایسا کام ہے جو ناصح اور امین بن کر انجام دیا جاتا ہے۔ یعنی خدا کی نسبت سے امانت دار اور بندوں کی نسبت سے ناصح اور خیر خواہ۔

اس غلطی نے موجودہ زمانہ میں دعوت کے اصل مقصد ہی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ دعوت کی مہم کا اصل مقصد یہ ہے کہ خدا کے بندے خدا کے تخلیقی منصوبہ سے آگاہ ہوں۔ وہ خدا کی مرضی سے واقف ہو کر اس کے مطابق زندگی گزاریں۔ اور پھر خدا کی رحمت ونصرت کے مستحق بنیں۔ اور جو لوگ اس کو ماننے سے انکار کریں، ان پر خدا کی حجت تمام ہو، اور آخرت میں وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں آپ کے تخلیقی منصوبہ کی خبر نہیں تھی۔ اس لئے ہم اس کی ذمہ داری سے بری ہیں۔

موجودہ زمانہ میں دعوت کے نام پر مسلمانوں نے جو سرگرمیاں جاری کر رکھی ہیں اور جن کو مجموعی اعتبار سے صحوۃ اسلامیہ (اسلامی بیداری) کہا جاتا ہے، اس میں یہ سارا مقصد فوت ہو گیا ہے۔ اصل دعوتی مہم میں مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان داعی اور مدعو کا تعلق قائم ہوتا ہے، مگر موجودہ نام نہاد صحوہ اسلامیہ میں دونوں ایک دوسرے کے لئے قومی حریف یا قومی رقیب بن گئے ہیں۔

اسی قسم کا برعکس نتیجہ خود مسلمانوں کی نسبت سے ظاہر ہوا ہے۔ چنانچہ موجودہ قسم کی سرگرمیوں نے اس چیز کا خاتمہ کر دیا ہے جو اصلاً اسلام کا مطلوب ومقصود ہے۔ دعوت الی اللہ کا عمل جب مطلوب صورت میں جاری ہو تو وہ مسلمانوں کے اندر مثبت کیفیات کو ابھارتا ہے۔ مگر موجودہ سرگرمیوں نے برعکس طور پر مسلمانوں کے اندر منفی کیفیات کو فروغ دیا ہے۔

صحیح دعوتی عمل آدمی کے اندر دوسروں کے حق میں شفقت کے جذبات پیدا کرتا ہے مگر موجودہ قسم کے عمل نے مسلمانوں کے اندر نفرت کے جذبات پیدا کر دئے ہیں۔ صحیح دعوتی عمل آدمی کو یک طرفہ صبر کرنا سکھاتا ہے مگر موجودہ قسم کے عمل نے مسلمانوں کو بے صبر حتی کہ تشدد پسند بنا دیا ہے۔ صحیح دعوتی عمل آدمی کو دوسروں کی ہدایت کا حریص بناتا ہے۔ مگر موجودہ عمل نے مسلمانوں میں صرف یہ جذبہ ابھار رکھا ہے وہ لوگوں کو زیر کر کے ان کے اوپر غالب آجائیں۔ صحیح دعوتی عمل یہ سکھاتا ہے کہ دوسروں کی زیادتیوں کو معاف کر دو۔ مگر موجودہ عمل نے مسلمانوں کا یہ حال کر رکھا ہے کہ ہر ایک دوسری قوموں کی سازشوں

کے انکشاف کا ماہر بنا ہوا ہے۔ صحیح دعوتی عمل آدمی کے اندر اس نفسیات کو بیدار کرتا ہے کہ اس دنیا میں اس کی ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں۔ مگر موجودہ عمل نے ہر مسلمان کو اپنے حقوق کی جدوجہد کا شہسوار بنا رکھا ہے۔ صحیح دعوتی عمل لوگوں کے اندر روحانیت کی لطیف کیفیات کو جگاتا ہے۔ مگر موجودہ عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نے ہر مسلمان کے اندر سیاست کا طوفانی جوش ابھار دیا ہے۔

اس غلطی کا یہ شدید تر نتیجہ نکلا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر مثبت سرگرمیاں جنم نہ لے سکیں۔ اس کے برعکس ان کے درمیان ہر طرف منفی باتوں اور منفی سرگرمیوں کا دور دورہ ہے۔ مسلمانوں کو اہل عالم کے لئے دوبارہ نفع بخش بننا تھا۔ مگر احتجاج اور شکایت کی مہم نے عملاً ان کو ایک قسم کا پروٹسٹنٹ گروہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اہل عالم کے لئے اثاثہ بننے کے بجائے وہ اہل عالم کے لئے بوجھ بن کر رہ گئے ہیں۔

کسی تحریک کے صحت وسقم کو جانچنے کے لئے سب سے زیادہ آسان اور قریبی معیار یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ جو لوگ اس سے متاثر ہوئے ہیں ان میں یہ تحریک کس قسم کا ذہن اور مزاج بناتی ہے۔ افرادِ تحریک کا مزاج تحریک کے صحت وسقم کو جانچنے کا یقینی معیار ہے۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمانہ کی تقریباً تمام اسلامی تحریکوں نے اپنے افراد کے اندر جو مزاج بنایا ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی کہیں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہو تو فوراً وہ اس کو اپنے لئے عزت ووقار کا سوال بنا لیتے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک قومی مزاج ہے نہ کہ دعوتی مزاج۔ دعوتی مزاج کیا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے دور نبوت کی ایک مثال لیجئے۔ یہ مثال وہ ہے جو مدنی دور میں صلح حدیبیہ کے بحرانی وقت میں سامنے آئی۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ، قریش نے حدیبیہ کے سفر میں رکاوٹ ڈال کر رسول اور اصحاب رسول کو اس سے روک دیا تھا کہ وہ مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کریں۔ ظاہری حالات کے اعتبار سے مصلحت کا تقاضا تھا کہ اس نازک موقع پر کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے جو اسلام اور اہل اسلام کی عزت و وقار کو مجروح کرنے والا ہو۔ مگر اس وقت اس قسم کے اندیشوں کو یکسر نظر انداز کر کے قریش سے یکطرفہ صلح کا معاملہ کیا گیا۔ اور تمام مسلمان عمرہ کئے بغیر حدیبیہ کے مقام سے واپس لوٹ آئے۔

اس وقت ایک نہایت نازک مسئلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کا تھا۔ آپ نے سفر سے پہلے مدینہ میں خواب دیکھا تھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کر رہے ہیں۔ اسی خواب کا اعلان کر کے آپ مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ اب عمرہ کئے بغیر حدیبیہ سے واپس لوٹ جانا بے حد نازک معاملہ تھا۔ کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ ایسا کرنے کے بعد لوگ نعوذ باللہ آپ کی پیغمبری پر شک کرنے لگیں گے اور آئندہ آپ کی باتوں پر زیادہ یقین نہیں کریں گے۔

حدیبیہ میں قیام کے دوران قریش کے لوگوں نے کئی بار سرکشی کی۔ مثلاً ایک بار عین نماز کی حالت میں آ کر صحابہ پر پتھر مارنے لگے۔ ایک بار ایک صحابی کو تیر مار کر ھلاک کر دیا۔ وغیرہ۔ اب سوال تھا کہ اگر ان کی ان حرکات پر خاموشی اختیار کر لی جائے تو وہ دلیر ہو جائیں گے اور آئندہ مسلمانوں کے خلاف اور زیادہ زیادتیاں کریں گے۔

ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ اگر رسول اور اصحاب رسول عمرہ کئے بغیر اپنے وطن کو واپس چلے جائیں تو قریش کے حوصلے بہت بڑھ جائیں گے۔ آج وہ عمرہ کو روک رہے ہیں۔ کل وہ حج پر پابندی لگائیں گے۔ آج وہ مکہ میں داخل ہونے نہیں دے رہے ہیں۔ کل وہ مدینہ میں بھی ہمارا رہنا مشکل کر دیں گے۔ اس لئے ضروری تھا کہ پہلے ہی موقع پر سخت کارروائی کر کے ان کا حوصلہ توڑ دیا جائے۔

رسول اور اصحاب رسول کے لئے عمرہ کا یہ سفر ایک علامتی حیثیت رکھتا تھا۔ بظاہر اسی کے اوپر یہ فیصلہ ہونا تھا کہ آئندہ عرب میں مذہبی اعتبار سے کیا صورت حال رہے گی۔ مسلمان اپنے مذہبی عقیدہ کے مطابق، اس ملک میں رہنے دئے جائیں گے یا نہیں رہنے دئے جائینگے گویا یہ محض ایک عمرہ کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ علامتی طور پر وہ مذہبی آزادی کا وسیع تر مسئلہ تھا۔

مگر پیغمبر کی نظر میں یہ سب کی سب جزئی مصلحتیں تھیں۔ زیادہ بڑی اور کلی مصلحت یہ تھی کہ حالات کے اندر چھپے ہوئے دعوتی مواقع کو استعمال کیا جا سکے۔ چنانچہ آپ نے جزئی مصلحتوں کو نظر انداز کر دیا اور کلی مصلحت کو اہمیت دیتے ہوئے قریش سے امن کا معاہدہ کر لیا۔

صحیح اجتہاد اور صحیح عملی منصوبہ بنانے کے لئے سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ

مسلمانوں میں مثبت ذہن ہو۔ وہ عزت اور بے عزتی کے احساس سے اوپر اٹھ کر معاملات کو دیکھتے ہوں۔ ان میں یہ صلاحیت ہو کہ کسی کی مخالفانہ روش ان کے ذہنی توازن کو درہم برہم نہ کرے۔ وہ معاملات کو قومی تعصب کی نظر سے نہ دیکھیں بلکہ بے آمیز نگاہ سے خالص اصولی اعتبار سے ہر بات کا جائزہ لیں۔ ان کا نقطۂ نظر ردعمل کے تحت نہ بنے بلکہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کی روشنی میں طے پائے۔

مسلمانوں کے عوام اور خواص دونوں اس معیار سے بہت زیادہ دور ہو گئے ہیں۔ اس لئے آج پہلا کام یہ ہے کہ انھیں دوبارہ اس معیار حق پر لایا جائے۔ جب تک ان میں یہ معیار پیدا نہ ہو، وہ نہ فکری اعتبار سے کوئی بڑا کام کر سکتے ہیں اور نہ عملی اعتبار سے۔

ایک تقریر

"پرشین انفلوئنس آن انڈین کلچر" ایک وسیع سبجیکٹ ہے۔ اس کے مختلف پہلو ہیں۔ یہاں میں اس کے صرف ایک پہلو پر اختصار کے ساتھ کچھ عرض کروں گا۔ یہ پہلو ہے — فارسی مقولوں اور فارسی اشعار کا ہندستانی سوسائٹی میں رواج اور اس کے اخلاقی اثرات۔

۲ا نومبر ۱۹۹۴ کا واقعہ ہے۔ میں انڈین ایر لائنز کی مارننگ فلائٹ کے ذریعہ دہلی سے بڑودہ جارہا تھا۔ راستہ میں حسب معمول میں اپنے بیگ سے قلم کاغذ نکال کر کچھ لکھنے لگا۔ میرے پاس کی سیٹ پر زیادہ عمر کے ایک ہندو بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا نام مسٹر مکند دوبے (Mr. Mukund Dubey) ہے۔ ریٹائر ہونے سے پہلے وہ ہندستان کی فارن سروس میں تھے۔ اب وہ دہلی میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں (Tel. 3718047)

مجھ کو لکھتے ہوئے دیکھ کر مسٹر دوبے نے کہا: اردو لکھ رہے ہیں یا فارسی۔ میں نے پوچھا کیا آپ فارسی جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ میں ایران بھی جا چکا ہوں۔ میں نے دوبارہ کہا کہ فارسی کا کوئی مقولہ جو آپ کو یاد ہو بتائیے۔ انھوں نے شیخ سعدی کا یہ مقولہ میرے کاغذ پر لکھ دیا: چگونہ شکر نعمت گزارم کہ مردم آزاری ندارم (خدا کی اس نعمت کا میں کس طرح شکر ادا کروں کہ میں لوگوں کو ستانے کی طاقت نہیں رکھتا)

یہ چھوٹا سا واقعہ ایک دور کو بتاتا ہے جب کہ ہندستان میں پڑھے لکھے ہندو اور مسلمان عام طور پر فارسی زبان جانتے تھے۔ فارسی کے حکیمانہ مقولے اور اشعار لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ مجلسوں میں فارسی کے الفاظ اور جملے اس طرح دہرائے جاتے تھے جس طرح آجکل انگریزی کے الفاظ اور جملے دہرائے جاتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ہمارے گھروں میں فارسی کا عام رواج تھا۔ عورتیں تک فارسی زبان سیکھتی تھیں۔ تقریباً ۶۰ سال پہلے کی بات ہے۔ ہمارے گھر کی ایک خاتون مسلمہ خانم نے اپنے والد مولانا اقبال احمد سہیل سے فارسی پڑھنا شروع کیا۔ انھوں نے فارسی انشا کی ایک کاپی بنائی۔ اس پر وہ اردو جملوں کو فارسی میں تبدیل کرتی تھیں اور پھر اصلاح

کے لئے اسے مولانا سہیل کو دکھاتی تھیں۔ اس کاپی کے صفحۂ اول پر انھوں نے جلی حرفوں میں لکھا تھا ـــــ "از اردو فارسی ساختن" مولانا سہیل نے ان کو دیکھا تو اس کو کاٹ کر اس کے بجائے حسب ذیل الفاظ لکھ دئے: عبارت اردو را بہ پارسی آوردن۔

تاریخی طور پر ہندستان میں تقریباً ۷۰۰ سال کا زمانہ ایسا گزرا ہے جب کہ ملک میں فارسی زبان کو اسی طرح غلبہ حاصل تھا جس طرح انگریز کے آنے کے بعد یہاں انگریزی زبان کو غلبہ حاصل ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک محمد بن قاسم کو چھوڑ کر ملک میں جتنے بھی مسلم فاتحین آئے تقریباً سب کی زبان فارسی تھی۔ چنانچہ الناس علیٰ دین ملوکہم کے اصول پر فارسی زبان اور کلچر کو یہاں غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔

اس تاریخی عمل کے اثرات آج بھی مختلف صورتوں میں یہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً آج بھی کسی مہمان کی آمد پر خوش آمدید کہنا یا رخصتی کے وقت خدا حافظ کہنا براہ راست طور پر فارسی زبان و تہذیب کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

اس دور میں فارسی زبان اور کلچر کے جو اثرات ملک کے اوپر پڑے ان میں سے ایک یہ تھا کہ فارسی کے اقوال اور اشعار زبان زد عام ہوگئے۔ خاص طور پر اہل علم کے درمیان عام طور پر یہ حال ہوگیا کہ کسی بھی موقع پر کوئی حکیمانہ بات یا کوئی سبق آموز کلمہ کہنا ہو تو فوراً فارسی کا کوئی ضرب المثل یا کوئی شعر لوگوں کی زبان پر آجاتا تھا۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اس ملک میں صدیوں تک یہ حال رہا ہے کہ نہ صرف کلچر کے پہلوؤں میں فارسی زبان کے اثرات ظاہر ہوئے بلکہ یہاں کی سماجی زندگی میں اخلاقیات کی تشکیل کا ذریعہ سب سے زیادہ فارسی اقوال و امثال بنے رہے۔

مثلاً ایک لمبے زمانہ تک یہ حال تھا کہ کسی ہندستانی گھر میں کوئی مہمان آتا اور اس کے کھانے کے لئے کپڑے کا دسترخوان بچھایا جاتا تو اس کے اوپر یہ فارسی شعر لکھا ہوا ہوتا تھا:

شکر بجا آر کہ مہمان تو　　روزیٔ خود می خورد برخوان تو

یعنی شکر ادا کر کہ تمہارا مہمان اپنی روزی کو تمہارے دسترخوان پر کھا رہا ہے۔ اس طرح صدیوں تک فارسی زبان اس ملک میں حکمت ربانی اور اخلاقیات انسانی کی اشاعت کا ذریعہ بنی رہی۔ لوگوں کی سوچ اور ان کا اخلاقی سلوک فارسی کلچر سے غیر معمولی طور پر متاثر رہا۔

۱	راہ راست برو گرچہ دور است	درست راستہ چلو خواہ وہ دور ہو
۲	مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید	مشک وہ ہے جو خود مہکے نہ کہ عطار کہے۔
۳	یک در گیر و محکم گیر	ایک دروازہ پکڑو اور جم جاؤ
۴	خوردن برائے زیستن است نہ زیستن برائے خوردن	کھانا زندگی کے لئے ہے نہ کہ زندگی کھانے کے لئے
۵	تونگری بہ دل است نہ بہ مال	دولت مندی دل سے ہے نہ کہ مال سے
۶	چاہ کن را چاہ در پیش	کنواں کھودنے والے کے سامنے کنواں ہوتا ہے
۷	آن است جوابش کہ جوابش نہ دہی	اس کا جواب یہ ہے کہ جواب نہ دو
۸	گربہ کشتن روز اول	بلی کو پہلے ہی دن ہلاک کرو
۹	دیر آید درست آید	جو دیر میں ہوتا ہے وہ درست ہوتا ہے۔
۱۰	شنیدہ کے بود مانند دیدہ	سنا ہوا کب دیکھنے کی طرح ہوتا ہے۔
۱۱	جوئیندہ یابندہ	ڈھونڈنے والا پاتا ہے
۱۲	یک من علم را دہ من عقل باید	ایک من علم کے لئے دس من عقل چاہئے۔
۱۳	بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال	بزرگی کا تعلق عقل سے ہے نہ کہ زیادہ عمر سے۔
۱۴	صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد	صبر کڑوا ہے مگر اس کا پھل میٹھا ہے۔
۱۵	آں چہ برخود پسندی بر دیگراں پسند	جو چیز اپنے لئے پسند نہ ہو اس کو دوسروں کیلئے بھی پسند نہ کرو
۱۶	عاقلاں را اشارہ کافی است	عقل مند کے لئے اشارہ کافی ہے۔
۱۷	قطرہ قطرہ دریا گردد	بوند بوند مل کر دریا بنتا ہے۔
۱۸	جوئندہ یابندہ	ڈھونڈنے والا پاتا ہے۔
۱۹	چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی	عقلمند وہ کام کیوں کرے جس کے بعد شرمندہ ہونا پڑے
۲۰	پدرم سلطان بود	میرا باپ بادشاہ تھا
۲۱	داشتہ بکار آید	رکھا ہوا کام آتا ہے
۲۲	یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد	میں ایک لمحہ کے لئے غافل ہوا اور سو سال دور ہو گیا۔
۲۳	مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش	ہوشیار چڑیا جال میں پھنس جائے تو اس کو تحمل کرنا چاہئے

یہ صرف فارسی زبان کی بات نہیں بلکہ یہ کم وبیش ہر زبان کی بات ہے۔ ہر زبان میں پہلے اسی طرح سبق اور نصیحت کے کلمات عمومی طور پر رائج ہوتے تھے، ان کلمات سے لوگوں کو اصلاحی شعور اور اخلاقی جذبہ ملتا تھا مگر موجودہ زمانہ میں یہ صورت حال تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ اب ہماری زبانیں اخلاق کی معلم نہیں رہیں بلکہ کھیل وتفریح جیسے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ قدیم زمانہ جس کو روایتی زمانہ کہا جاتا ہے وہ پیغمبروں کی تعلیمات سے بنا تھا۔ ہر قوم میں ایسے مصلحین بڑی تعداد میں پیدا ہوتے رہے جنھوں نے نصیحت اور سبق کی باتیں کیں۔ ان کی یہ باتیں مقولے اور کہاوت بن کر لوگوں کے درمیان عمومی طور پر پھیل گئیں۔ لوگ مختلف مواقع پر ان مقولوں کو دہراتے اور ان سے سبق لیتے۔

موجودہ زمانہ میں جو صنعتی انقلاب آیا اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے انسانیت کو روایتی دور سے نکال کر سائنسی دور میں پہنچا دیا۔ یہ اس کا ظاہری پہلو ہے مگر اس کا داخلی پہلو یہ ہے کہ اس نئے انقلاب نے آزادی کے نام پر لوگوں کے ذہن ومزاج کو پوری طرح بدل ڈالا ہے۔ اب لوگوں کے درمیان جو مقولے رائج ہوئے وہ مصلحین کے مقولے نہ تھے بلکہ وہ کھلاڑیوں اور فلمی ہیروں کے مقولے تھے۔ مذہبی شخصیتوں کی جگہ سیاسی شخصیتوں نے لے لی، صوفیوں اور درویشوں کی جگہ سماج میں ان لوگوں کو غلبہ حاصل ہوگیا جو اپنے ساتھ مادی اور ظاہری رونقیں رکھتے تھے۔

اس تبدیلی نے پوری صورت حال کو بدل ڈالا ہے۔ آج اسکول سے لے کر ٹی وی تک لوگوں کی تربیت اس سے مختلف انداز میں ہو رہی ہے جو پہلے اخلاقی نصیحتوں کے زیر سایہ ہو رہی تھی ——— موجودہ زمانہ میں عمومی سطح پر جو اخلاقی بگاڑ دکھائی دیتا ہے اس کی کم از کم ایک وجہ یہ بھی ہے۔

متفرقات سفر

حدیث میں آیا ہے کہ : السفر قطعة من العذاب (فتح الباری ۳/۲۸۷) یعنی سفر عذاب کا ایک جزء ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ سفر کوئی بری چیز ہے اور اہل ایمان کو سفر نہ کرنا چاہیے۔ اس حدیث میں "عذاب" دراصل تعب اور مشقت کے معنی میں ہے یہ بات خود روایت کے اگلے الفاظ سے ثابت ہے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ سفر آدمی کو کھانے اور پینے اور سونے سے روک دیتا ہے (یمنع احدکم طعامه وشرابه ونومه) النووی نے اس کی یہی تشریح کی ہے (صحیح مسلم بشرح النووی) ۱۳/۷۰

تعب اور مشقت اسلام کے دوسرے اعمال میں بھی ہے مثلاً روزہ، حج، جہاد وغیرہ۔ واقعات بتاتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار سفر فرمایا۔ نبوت سے پہلے آپؐ نے تجارتی اسفار کیے، نبوت کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ مثلاً دعوتی سفر، ہجرت کا سفر، جہاد کا سفر، حج اور عمرہ کا سفر، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ سفر بے حد اہم چیز ہے۔ اگر وہ صحیح ذہن کے ساتھ کیا جائے تو سفر عین عبادت بن جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں اہل ایمان کی ایک صفت السائحون بتائی گئی ہے۔ یعنی سفر کرنے والے (التوبہ ۱۱۲)

موجودہ دنیا میں ہر اچھے کام کے ساتھ مشقت جڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح سفر بھی ایک مشقت کا معاملہ ہے مگر کسی چیز کا پُر مشقت ہونا کوئی برائی کی بات نہیں۔ یہ دراصل مشقت ہی ہے جو کسی عمل میں جان پیدا کرتی ہے۔ مشقت انسان کے دل دماغ کو جگاتی ہے۔ مشقت کے ذریعہ آدمی کے تجربات میں اضافہ ہوتا ہے۔ مشقت آدمی کو نئے نئے تجربات تک پہنچاتی ہے اور اس طرح اس کی تخلیقیت میں اضافہ کرتی ہے۔

مجھے اپنی زندگی میں کثرت سے اسفار پیش آئے ہیں ان اسفار کے ذریعہ میں نے بہت کچھ جانا۔ ان سفروں کے ذریعہ مجھے "السائحون" کی اہمیت سمجھ میں آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ علم کا پچاس فی صد حصہ اگر مطالعہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے تو اس کا بقیہ پچاس فی صد سیاحت اور سفر کے

ذریعہ۔ کتابی مطالعہ اگر معلومات کو بڑھاتا ہے تو سفر تجربات میں اضافہ کا ذریعہ ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ متفرق تاثرات و تجربات یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

ایک صاحب نے کشمیر کے بارہ میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ الجمعیۃ کے زمانہ (۱۹۶۷) سے میں ایک ہی بات کہتا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ کشمیر کا مسئلہ ۱۹۴۷ میں طے ہو چکا۔ اس قسم کے معاملات تاریخی عوامل کے تحت طے ہوتے ہیں۔ اور تاریخی عوامل اس کو قطعی طور پر طے کر چکے ہیں۔ اب غوغائی سیاست یا گن کلچر کے ذریعہ اس فیصلہ کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اس لیے حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ کشمیر کے لوگ تاریخ کے فیصلہ کو قبول کریں اور موجودہ سیاسی نظام کے تحت تعمیری میدانوں میں اپنا مستقبل بنائیں۔

۱۹۸۹ میں جب مسلح کشمیری تحریک چلی، اس کے بعد بھی بار بار میں یہ بات مختلف طریقہ سے کشمیریوں تک پہنچاتا رہا ہوں۔ میڈیا میں اس سلسلہ میں جو کچھ میں نے کہا وہ عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے۔ اس کے علاوہ میری ذاتی ڈائری میں بعض نہایت عبرت انگیز اندراجات اس کی بابت موجود ہیں۔

۱۔ مسلح جدوجہد شروع ہونے کے جلد ہی بعد ۱۳ دسمبر ۱۹۸۹ کو کشمیر کے ایک صاحب مجھ سے دہلی میں ملے۔ یہ مسٹر منظور احمد عرف سیف اللہ (محلہ خانیار، سری نگر) تھے۔ انھوں نے اپنی تحریک کی کامیابی کے بارہ میں نہایت جوش کا مظاہرہ کیا۔ میری ڈائری میں مذکورہ تاریخ کے صفحہ میں ان کے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں: "کشمیر پانچ سال میں آزاد ہو جائے گا"

کشمیری نوجوان کے ان الفاظ کے نیچے ڈائری میں میں نے اپنی رائے ان لفظوں میں لکھی تھی: "میں نے کہا کہ یہ صرف نادانی کی بات ہے۔ اس طرح کشمیر کو آزاد کرنا ممکن نہیں ہے موجودہ حالت میں آزاد کشمیر کی تحریک صرف کشمیر کو برباد کرنے کی تحریک ہے"

۲۔ دوسرا واقعہ ۲۷ جنوری ۱۹۹۲ کا ہے۔ اس روز سری نگر کے ایک اسلام پسند غلام نبی ہاگرو ایڈوکیٹ مجھ سے دہلی میں ملے۔ انھوں نے بھی کشمیری تحریک کے مستقبل کے بارہ میں نہایت پر جوش باتیں کیں۔ انھوں نے میری ڈائری میں مذکورہ تاریخ کے تحت اپنے قلم

سے حسب ذیل الفاظ لکھے : "ہندستان سے علٰحدگی کے بعد جو کشمیر بنے گا، ان شاء اللہ وہ کشمیر اسلامی کشمیر ہوگا"

ان کی اس تحریر کے نیچے ڈائری میں میری رائے ان الفاظ میں لکھی ہوئی ہے : "میرے نزدیک ہندستان سے علٰحدہ ہو کر (بالفرض) جو آزاد کشمیر یا پاکستانی کشمیر بنے گا وہ ایک برباد کشمیر ہوگا۔ کشمیریوں کے لیے جو اٹس ہندستانی کشمیر یا پاکستانی کشمیر میں نہیں ہے، بلکہ ہندستانی کشمیر یا برباد کشمیر میں ہے"

۱۹۸۹ میں جب کشمیر کے لوگوں نے اپنی مسلح تحریک شروع کی تو وہ سمجھتے تھے کہ وہ "انڈیا" کے خلاف اپنی تحریک شروع کر رہے ہیں۔ مگر حقیقۃً وہ تاریخ کے خلاف لڑنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے، اور تاریخ کے خلاف لڑ کر کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اپنی تحریک کے آغاز میں جو کشمیری امیدوں اور حوصلوں سے بھرے ہوئے نظر آتے تھے، آج وہ مایوسی اور پست ہمتی کا شکار ہو چکے ہیں۔ انھیں محسوس ہو رہا ہے کہ انھوں نے اپنا سب کچھ کھو دیا، اور اس کے بدلے میں پایا کچھ بھی نہیں۔

اتنی بے معنی جنگ شروع ہی کیوں ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آج کل کی جنگ لڑنے والے شروع نہیں کرتے، بلکہ ہمیشہ لڑانے والے شروع کرتے ہیں۔ آج کل مسلمان جگہ جگہ جہاد کے نام پر جو خونیں ٹکراؤ کر رہے ہیں اس میں رہ نمایانہ کردار کون ادا کر رہا ہے۔ یہ وہ دانشور ہیں جو دور اپنے دفتروں میں بیٹھ کر اشتعال انگیز مضامین لکھتے ہیں۔ وہ لیڈر ہیں جو دوسرے ملکوں میں بیٹھ کر تیز و تند بیانات دیتے رہتے ہیں، وغیرہ۔ یہ سب جدید کمیونی کیشن اور میڈیا کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ پہلے زمانہ میں لڑانے والے کو بھی لڑنے والوں کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ اب نئے ذرائع کی بنا پر یہ ممکن ہو گیا ہے کہ لڑانے والا دور سے صرف الفاظ لکھ کر اور بول کر جہاد کا کریڈٹ لیتا رہے۔ جنگ اور ٹکراؤ کے نقصان سے وہ بھی محفوظ رہے اور اس کے بچے بھی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ اکثر مسلم قائدین پر تنقید کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ میں نے کہا کہ میں کسی قائد پر کبھی ذاتی تنقید نہیں کرتا۔ میں صرف ان کی عملی پالیسی پر تنقید کرتا ہوں۔ موجودہ زمانہ کے قائدین نے تقریباً بلا استثناء ایسا کیا ہے کہ انھوں نے ملت کو ایسی راہوں

میں دوڑا دیا جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ اور نکلنے والا نہ تھا۔ یہی آج ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ ہر جگہ نااہل مسلم قائدین یہی کر رہے ہیں۔ وہ تباہی و بربادی کے نقیب بنے ہوئے ہیں، پھر کیوں نہ ان پر تنقید کی جائے۔

میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اِنَّ شَرَّ الرعاء الحطمة (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ) حطم کے معنی ہیں چور چور کر دینا۔ حُطمہ اسی کا اسم مبالغہ ہے۔ یعنی سب سے برا چرواہا (قائد) وہ ہے جو لوگوں کو چور چور کر دینے والا یا کچل دینے والا ہو۔

اس حدیث کا ایک مصداق وہ حاکم ہیں جو اپنے اقتدار کا غلط استعمال کر کے لوگوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اس کا دوسرا مصداق وہ قائدین ہیں جو بھڑکانے والے نعرے اور جذباتی اقدامات کے ذریعہ مسلمانوں کو غیر ضروری طور پر طاقتور گروہوں سے لڑا رہے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ساری دنیا میں مسلمان یک طرفہ ہلاکت کا شکار ہو رہے ہیں۔ ایسے تمام قائدین پر فرض تھا کہ وہ چپ رہیں، وہ قوم کو ٹکراؤ کے راستہ پر نہ لے جائیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان جو ہر جگہ مظالم کا شکار ہو رہے ہیں، اس کو عام طور پر ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگ دشمنوں کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ انھیں نااہل قائدین کے غلط اقدامات کا نتیجہ ہیں۔ اس اعتبار سے یہ تمام قائدین ان شر الرعاء الحطمة کا مصداق ثابت ہوئے ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد ہمیں پچاس سال ملے مگر آزادی کے بعد ملک کی تعمیر کا جو کام ہونا تھا وہ نہ ہو سکا۔ آزاد ہندستان ایک تباہ ہندستان بنا ہوا ہے۔ آزادی کے بعد ہمیں ایک اور گاندھی کی ضرورت تھی جو ہمیں نہ مل سکا۔

میں نے کہا کہ یہ بات درست نہیں۔ یہ دوسرا گاندھی بھی ہم کو ملا مگر وہ کچھ کر نہ سکا۔ ۱۹۴۷ کے بعد بھی مہاتما گاندھی ایک عرصہ تک زندہ رہے مگر وہ نئے ہندستان میں بے اثر ہو گئے۔ حتیٰ کہ خود انھوں نے کہا کہ "اب میری کون سنے گا" انگریز مخالف سیاست میں گاندھی کامیاب تھے مگر ہندستان موافق سیاست میں گاندھی ناکام ہو گئے۔ منفی سیاست سب سے زیادہ آسان کام ہے، اور مثبت سیاست سب سے زیادہ مشکل کام۔

ایک صاحب سے موجودہ زمانہ کی مسلم دنیا کے حالات پر گفت گو ہوئی۔ آج کل ساری مسلم دنیا میں بے فائدہ ٹکراؤ اور بے معنی لڑائی عام ہے۔ ہر مسلمان اس کو جہاد کے نام پر لڑ رہا ہے۔ یہ سب تعلیم کی کمی کا نتیجہ ہے۔ تعلیم سے میری مراد صرف دینی تعلیم نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کے لیے عصری تعلیم بھی انتہائی ضروری ہے۔ تاکہ مسلمان اس حدیث کا مصداق بن سکیں : وان یکون بصیراً بزمانہ۔

ایک بار مسٹر رام جیٹھ ملانی کی رہائش گاہ (نئی دہلی) پر ایک میٹنگ تھی۔ اعلیٰ طبقہ کے کچھ ہندو شریک تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ ایک صاحب نے پیغمبر اسلام ؐ کے بارہ میں کہا کہ وہ امی تھے۔ رام جیٹھ ملانی نے فوراً جواب دیا : وہ امی تھے یا نہیں تھے، یہ الگ بات ہے۔ مگر میں تو یہ جانتا ہوں کہ انھوں نے ایک ایسی بات کہی جو اس وقت تک تاریخ میں کسی نے نہیں کہی تھی۔ انھوں نے کہا : عالم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔

۱۲ اپریل کو آغا سید برہان الدین شاہ صاحب کے یہاں صبح کی چائے تھی۔ ان کے جد امجد ۱۸۴۲ میں افغانستان سے ہندستان آئے تھے۔ انھوں نے کوہ نور ہیرے کا قصہ بتایا۔ اس کی تاریخ اگرچہ اختلافی ہے۔ تاہم عام طور پر مانا جاتا ہے کہ ایران کے نادر شاہ نے جب ۱۷۳۹ میں دہلی کو لوٹا تو وہ کوہ نور کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کی موت کے بعد وہ اس کے فوجی سردار احمد شاہ درانی (افغانستان) کو ملا اور اس کے بعد شاہ شجاع کو۔

انھوں نے بتایا کہ شاہ شجاع کوہ نور کو ہمیشہ اپنی پگڑی کے اندر رکھتا تھا۔ ایک بار مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے یہاں شاہ شجاع اور دوسرے والیانِ ریاست کو مدعو کیا۔ جب سب لوگ آکر بیٹھ گئے تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کہا : آج میں شاہ شجاع کا دستار بدل بھائی بنوں گا۔ شاہ شجاع نے کہا کہ اسے کور چشم، میں جانتا ہوں کہ تو کیا چاہتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی دستار سے ہیرا نکالا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کو دے دیا۔ ۱۸۴۹ میں جب پنجاب کو برٹش انڈیا میں ملا دیا گیا تو اس کے بعد رنجیت سنگھ کے لڑکے دلیپ سنگھ کوہ نور کو لے کر لندن گئے۔ وہاں انھوں نے اس کو ملکۂ برطانیہ وکٹوریہ کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد سے وہ تاج برطانیہ کا حصہ ہے۔

کیمیکل تجزیہ بتاتا ہے کہ ہیرا کوئلہ سے تیار ہوتا ہے۔ کروروں سال کے فطری عمل کے بعد سیاہ کوئلہ کا ایک ٹکڑا چمک دار ہیرا بن جاتا ہے۔

ہیرا خالص کاربن ہوتا ہے۔ اس کا ترکیبی جزء وہی ہے جو کوئلہ کا ہے۔ مگر کوئلہ سیاہ ہوتا ہے اور ہیرا انتہائی چمک دار۔ نیز ہیرا تمام معلوم مادوں میں سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ہیرا صرف زینت کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں اپنی انتہائی سختی کی وجہ سے وہ مختلف صنعتی مقاصد میں استعمال ہوتا ہے۔

ہیرا اور کوئلے کا یہ فرق علامتی طور پر حقیقی انسان اور غیر حقیقی انسان کے فرق کو بتاتا ہے۔ دونوں کی حیاتیاتی اصل اسی طرح ایک ہے جس طرح ہیرے اور کوئلے کی اصل ایک ہے۔ مگر حقیقی انسان خدا کی دنیا میں ہیرا انسان ہوتا ہے اور غیر حقیقی انسان صرف ایک کوئلہ انسان۔ دین کا کام ہو یا دنیا کا کام، ہر ایک کے لیے ہیرا انسان درکار ہوتے ہیں۔ کوئلہ انسان نہ دین کے کام کے ہیں اور نہ دنیا کے کام کے۔

ایک صاحب نے ایک مسلم دانشور کا مضمون دکھایا جو حیدر آباد کے ایک اخبار (۷ اپریل ۱۹۹۶) میں چھپا تھا۔ اس میں امریکہ کا تقابل ہندستان سے کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ امریکہ کی اقلیت کو تعصب کا سامنا نہیں۔ جب کہ ہندستان کی اقلیت کو تعصب کا سامنا پیش آرہا ہے۔ مضمون نگار نے لکھا تھا:

"امریکہ میں جنرل کولن پاویل کی ترقی کی داستان بتاتی ہے کہ امریکہ میں گزشتہ ۴۵ برسوں میں سفید فام امریکیوں کا سیاہ فام امریکیوں کے ساتھ امتیازی سلوک بہت بڑی حد تک ختم ہوا ہے۔ لیکن اس ۴۵ سال کی مدت میں ہندستان نے تعصب، فرقہ واریت اور تنگ نظری کی منزل کی سمت میں سفر کیا ہے"۔

میں نے کہا کہ یہ تقابل غلط ہے۔ امریکہ میں اگر اقلیت کے کچھ افراد نے ترقی کی ہے تو ہندستان میں بھی اقلیت کے بہت سے افراد نے ترقی کی ہے۔ آزادی کے بعد یہاں بہت سے اقلیتی افراد صدر، چیف جسٹس، ایر مارشل، گورنر، چیف منسٹر اور دوسرے عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ نہایت غلط رہنمائی ہے کہ ہندستان کی مایوسانہ تصویر پیش کرکے مسلمانوں کو بے حوصلہ کیا جائے۔

الرسالہ کے ایک قاری نے کہا کہ میں برابر الرسالہ پڑھتا ہوں۔ مگر آپ کی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ ہمیشہ مسلمانوں کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں آخر صبر کب تک۔ میں نے کہا کہ میں بھی آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ قرآن و حدیث میں بار بار نماز پڑھنے کے لیے کہا جاتا ہے آخر یہ نماز کب تک۔ انھوں نے کہا کہ نماز تو ایک عبادت ہے اور اس کو آخر دم تک ادا کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ یہی میرا جواب صبر کے بارہ میں ہے۔ صبر بھی ایک عبادت ہے اور اس کو آخر دم تک انجام دینا ہے۔ اسی لیے قرآن میں صبر اور نماز کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

غدر کی غیر منصوبہ بند اور تیاری کے بغیر لڑائی ۱۸۵۷ کے آغاز میں بیرک پور اور برہم پور (بنگال) سے شروع ہوئی۔ تاہم انگریزوں نے بہت جلد اس کو دبا دیا۔ اس کے بعد ۱۰ مئی ۱۸۵۷ کو میرٹھ چھاونی کے ہندستانی سپاہیوں نے بغاوت کردی۔ وہ ہتھیار لے کر نکل پڑے۔ یہاں کے انگریز افسروں کو مارا۔ ان کے گھر جلا دیے، وغیرہ۔ تاہم انگریز جو زیادہ بہتر ساز و سامان سے مسلح تھے، نیز وہ ٹیلی گراف کا نظام بھی قائم کر چکے تھے، انھوں نے دوسرے مقامات سے فوج بلا کر بغاوت کو کچل دیا، اور دہلی کی بہادر شاہ ثانی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا، جن کے نام پر بغاوت کی گئی تھی۔ یہ بغاوت، برعکس طور پر، ہندستان میں انگریزوں کے اقتدار کو زیادہ مستحکم کرنے کا ذریعہ بن گئی۔

اس کے بعد انگریزوں نے یہاں ۱۸۹۲ میں میرٹھ کالج قائم کیا۔ اس کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ لوگوں کا ذہن جنگ جوئی سے ہٹا کر تعلیم کی طرف موڑ دیا جائے۔ تاہم انگریزوں کا مقصد جو بھی ہو، اس علاقہ کے لوگوں کے لیے یہ ایک قیمتی موقع تھا۔ مگر اس وقت یہاں کے لوگ، خاص طور پر مسلمان، انگریزوں کے خلاف نفرت کی نفسیات میں مبتلا تھے، چنانچہ وہ اس تعلیمی موقع کی طرف راغب نہ ہو سکے۔ مسلمان اگر نفرت کے احساسات سے آزاد ہوتے اور ۱۸۹۲ میں قائم ہونے والے اس تعلیمی ادارہ سے بھرپور فائدہ اٹھاتے تو یقینی طور پر آج اس علاقہ کی تاریخ دوسری ہوتی۔

زندگی کا ایک راز وہ ہے جو ایک قول میں اس طرح کہا گیا ہے کہ علم حاصل کرو خواہ وہ چین میں ہو (اطلبوا العلم ولو کان بالصین) اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی کے پاس بھی سارے

مواقع نہیں ہوتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے قیمتی مواقع دوسروں کے پاس، حتی کہ دشمنوں کے پاس موجود ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں عقلمندی یہ ہے کہ اپنے اور غیر یا دوست اور دشمن کی تقسیم سے اوپر اٹھ کر ہر اس موقع کو استعمال کیا جائے جو ممکن اور قابل حصول ہو۔

خود سنت رسولؐ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ہجرت کے سفر میں آپ نے مکہ کے ایک مشرک (عبد اللہ بن اریقط) کو اپنا رہنما بنایا۔ جنگ بدر کے مشرک قیدیوں کے ذریعہ مدینہ کے مسلم بچوں کو تعلیم دلوائی۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ حکمت کی بات مومن کا گمشدہ مال ہے، جہاں وہ اس کو پائے تو وہی اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے (الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن فاین وجدھا فھو احق بھا) الترمذی، کتاب العلم

جو لوگ اس حکمتِ حیات کو جانیں وہی اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ اس حکمت سے بے خبر ہوں ان کے لیے خدا کی اس دنیا میں جو چیز مقدر ہے وہ صرف یہ کہ وہ انسانی قافلوں سے پچھڑ جائیں۔ اور اس کے بعد اپنے پچھڑے پن کا الزام دوسروں پر ڈالنے کے لیے لفظی احتجاج کا طوفان برپا کریں جس کو سننے کے لیے بھی وہاں ان کے سوا کوئی شخص موجود نہ ہو۔

میرٹھ کے بارہ میں آپ کوئی معلوماتی کتاب پڑھیں تو اس میں لکھا ہوگا کہ ہندستان میں ۱۸۵۷ کی بغاوت کا آغاز نمایاں طور پر میرٹھ سے ہوا:

The initial uprising of the 1857 Indian Mutiny occurred there. (VI/753)

یہ واقعہ جس کو ہندستانیوں نے ریوولٹ کا نام دیا اس کو انگریزوں نے میوٹنی کہا تھا۔ میوٹنی اور ریوولٹ میں بہت فرق ہے۔ ریوولٹ وہ ہے جس میں پوری قوم شامل ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں میوٹنی چھوٹے درجہ کی باغیانہ شورش کو کہا جاتا ہے، جیسے سمندری جہاز کا عملہ اپنے کیپٹن کا باغی ہو جائے۔

۱۸۵۷ کی شورش کو انگریزوں نے میوٹنی کہا تو کچھ ہندستانی اس پر غصہ ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی جنگ آزادی کو میوٹنی کہنا ایک سازش ہے تاکہ اس کی اہمیت کو گھٹایا جا سکے۔

مگر یہی جنگ آزادی جب مہاتما گاندھی کی قیادت میں چلائی گئی تو انگریز اس کو میوٹنی نہ کہہ سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "سازش" کی ایک حد ہے۔ جب معاملہ اس حد سے گزر جائے تو اس کے خلاف کوئی سازش کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں رہتا۔

تقریباً چالیس سال پہلے میری ملاقات میرٹھ کے ایک مسلمان سے ہوئی تھی۔ وہ لمبے قد کے شاندار شخصیت کے آدمی تھے، مگر وہ دونوں آنکھوں سے اندھے ہو چکے تھے۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں وہ فوج کو انڈا سپلائی کرنے کا کام کرتے تھے۔ وہ دیہاتوں سے انڈے منگاتے تھے، روزانہ بہت سے انڈے ٹوٹے ہوئے نکلتے تھے، انھوں نے ان انڈوں کو پھینکنا پسند نہیں کیا۔ اس کے بجائے وہ خود انھیں کھانے لگے۔ روزانہ صبح سے شام تک وہ تقریباً پچاس انڈے کھا جاتے تھے۔ ابتداءً انھیں فائدہ محسوس ہوا۔ مگر اس غیر فطری خوراک کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ وہ مکمل طور پر اندھے ہو گئے۔

انڈا عام حالت میں ایک صحت بخش غذا ہے۔ مگر اس کی زیادتی ہلاکت خیز ثابت ہوتی ہے۔ یہی معاملہ ہر چیز کا ہے۔ اسی لیے اسلام میں اعتدال اور توسط کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ ہر معاملہ میں صحیح طریقہ وہی ہے جو فطری طریقہ ہو، اور فطری طریقہ ہمیشہ اعتدال کا طریقہ ہوتا ہے۔

میرٹھ کے ایک صوفی شاعر وارث میرٹھی تھے۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ نومبر ۱۹۴۷ میں پاکستان چلے گئے۔ ان کے صاحبزادے مظفر وارثی کا ایک انٹرویو قومی آواز (۲۸ اپریل ۱۹۹۶) میں چھپا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ پروفیسر طاہر القادری نے جب نظام مصطفوی کا نعرہ لگایا تو میں اپنی کشتیاں جلا کر ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ان کے لیے میں نے اسٹیٹ بینک کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ مگر ان کو قریب سے دیکھ کر میں بہت مایوس ہوا۔ وہ کسی بھی معاملہ میں فیئر نہیں، سیاست میں بھی نہیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ "طاہر القادری سے اپنے ہزار اختلاف کے باوجود میں ضرور کہوں گا کہ اس جیسا مقرر پورے برصغیر میں نہیں"۔

یہی موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مسلمانوں کا اصل المیہ ہے۔ لاجواب مقرر دوسرے

لفظوں میں صرف لاجواب لفاظ ہوتا ہے، اور لفاظ قسم کے لوگ کبھی کوئی صحیح عملی رہنمائی نہیں دے سکتے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے ہر جگہ یہی کیا ہے کہ انھوں نے ایسے افراد کو اپنا قائد بنایا جو لاجواب مقرر یا لاجواب شاعر یا لاجواب انشاء پرداز تھے۔ پچھلے سو سال میں ساری مسلم دنیا میں ایک بھی ایسی مثال نہیں کہ حکمت و تدبر والے کسی شخص نے مسلمانوں کے درمیان قیادت کا مقام حاصل کیا ہو۔ مقرر اور شاعر اور انشاء پرداز قسم کے لوگ تدبر یا گہری سوچ سے خالی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ یہی کر سکتے تھے کہ جذباتی الفاظ بول کر قوم کو ایسے خیالی راستوں کی طرف دوڑا دیں جس کا کوئی انجام نکلنے والا نہ ہو، اور انھوں نے یہی کام انجام دیا۔

یکم مئی ۱۹۹۶ کو میرٹھ میں ایک واقعہ ہوا۔ روزنامہ عوام (دہلی) کے نمائندہ مسٹر کامران زبیری کی رپورٹ کے مطابق، اس کی تفصیل یہ ہے:

• نخاسہ کوتوالی علاقہ میں آج دوپہر آپسی رنجش کے تحت ایک شخص نے اپنے ہی پڑوسی کو چاقوؤں سے گود کر جان سے مار ڈالا، جس سے علاقہ میں تناؤ کا ماحول بن گیا اور اس حادثے کو فرقہ وارانہ سمجھ کر بازار بند ہو گئے۔ موصولہ اطلاعات کے مطابق محلہ محل والا کے رہنے والے عقیل نے اپنے پڑوسی شیر افگن کو چاقوؤں سے گود دیا جس سے موقع پر ہی اس کی موت ہو گئی۔ بتایا جاتا ہے کہ چاقو لگنے کے بعد شیر افگن بھاگتا ہوا پڑیوں کے محلے میں پہنچا، وہاں اس نے دم توڑ دیا۔ غیر مسلم محلے میں مرنے کی وجہ سے کچھ لوگوں نے اسے فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش میں یہ افواہ اڑا دی کہ ایک مسلمان کو ہندوؤں نے مار دیا، جس سے علاقہ میں زبردست کشیدگی پھیل گئی اور ذرا سی دیر میں سبھی بازار بند ہو گئے۔ علاقہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ریپڈ ایکشن فورس کے جوان فوراً ہی موقع پر نہ پہنچ جاتے اور عقیل کو گرفتار نہ کر لیتے تو یہاں فساد تک ہونے کا اندیشہ تھا کیوں کہ مارنے والا ہندو بتایا جا رہا تھا۔ اس حادثے کے بعد شاہین پرویز اور اظہار منظور نے علاقہ میں پہنچ کر لوگوں کی غلط فہمی کو دور کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ شیر افگن کی ایک بہن کی شادی ۷ مئی کو دہلی میں ہونی تھی اور گھر کے دوسرے سبھی افراد پہلے ہی دہلی روانہ ہو چکے تھے لیکن وہ یہاں سے ایک ٹیپ ریکارڈر ٹھیک کروانے کے لیے رک گیا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ

ان لوگوں میں آپس میں رنجش کسی لڑکی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے معاملے کو لے کر تھی۔ علاقہ میں زبردست کشیدگی کو دیکھتے ہوئے بھاری پولیس فورس تعینات کر دی گئی ہے اور پولیس و انتظامیہ کے اعلیٰ افسران موقع پر پہنچ گئے ہیں۔ حالات قابو میں ہیں"۔

فسادات بیشتر حالات میں غلط فہمی کی بنا پر ہوتے ہیں۔ غلط فہمی اور افواہیں بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ جاتی ہیں جہاں معاملہ پولیس اور انتظامیہ کے قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ الم ناک صورت حال پیش آتی ہے جس کو فساد کہا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو کہ کوئی واقعہ پیش آتے ہی فوراً مقامی ذمہ داران حرکت میں آجائیں تو واقعہ ایک حد پر رک جائے گا اور سرکاری انتظامیہ کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ اس کو کنٹرول کر سکے، جیسا کہ مذکورہ واقعہ میں پیش آیا۔

کان پور کے جناب نیاز احمد صاحب (Tel. 607437) نے ۱۶ دسمبر ۱۹۹۷ء کی ایک ملاقات میں کہا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ ہمارے لیے پولیس یا پی۔ اے۔ سی کا کوئی مسئلہ نہیں جیسے ہم انسان ہیں ویسے ہی وہ بھی انسان ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے کچھ پُر جوش نوجوان خود اپنی نادانی سے ان کو غیر ضروری طور پر اپنا دشمن بنا لیتے ہیں۔ مثلاً وہ دیواروں پر لکھ دیں گے کہ پی۔ اے۔ سی مُردہ باد۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے نعروں کے بعد ان کے دل میں ہمارے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

انھوں نے اپنا تجربہ بتایا کہ پچھلے عید کے موقع پر حسب معمول ان کی ڈیوٹی لگی ہوئی تھی۔ ہمارے محلہ میں ایک جگہ تقریباً چھ پی اے سی کے جوان ڈیوٹی پر تھے۔ میں نے یہ کیا کہ عید کے دن ایک ٹرے میں سوئیاں وغیرہ رکھ کر ان کے پاس گیا اور کہا کہ یہ ہماری طرف سے آپ لوگوں کے لیے عید کا تحفہ ہے۔ اس سے وہ لوگ اتنا زیادہ متاثر ہوئے کہ وہ منظر نظر آنے لگا جو قرآن کی اس آیت میں بیان ہوا ہے ——— پس تمہارے اور جس کے درمیان بظاہر عداوت ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کہ تمہارا کوئی قریبی دوست (حم السجدۃ ۳۴)

اس کے بعد ان پولیس والوں کا یہ حال ہوا کہ جب وہ مجھ کو دیکھتے تو فوراً ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاتے اور کہتے کہ چاچا جی، ہمارے لائق کوئی کام ہو تو بتائیے ہم آپ کی سیوا میں ہیں۔

میلہ نوچندی میگزین، میرٹھ، ۱۹۹۳ میں ایک نوجوان کی موت کا واقعہ پڑھا اس کا عنوان یہ تھا: آفریں طارق ارشد شہید، ناموس انسانیت۔ کئی صفحے کے اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ:

"۲۲ سالہ طارق ارشد نے میرٹھ کے فساد ۱۹۹۰ میں اپنی جان قربان کردی۔ طارق ارشد کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ فساد کے دوران اس نے اپنے پڑوسی غیر مسلموں کو اپنی جان پر کھیل کر ان کو موت سے بچایا تھا۔ اور جب ایک مسلم نوجوان جس کو غیر مسلم فسادیوں نے شہید کردیا تھا اور اس کی لاش مسلم نوجوان اٹھاکر لے گئے تھے، طارق نے لاش حاصل کرنے کے لیے پولیس کو طاقت کے استعمال سے روک دیا، اور مسلمانوں سے لاش کو پولیس کے سپرد کرنے کو کہا۔ اس پر مشتعل ہوکر یہ کہتے ہوئے کہ اس نے تین کافروں کو بچایا ہے، طارق کے فرقہ کے لوگوں نے ہی اس کو چاقو مار کر شہید کردیا۔

یہ ایک اہم واقعہ ہے۔ لیکن میگزین میں اس کو بالکل غیر واضح اور ادبی اسلوب میں بیان کیا گیا تھا جس کا اندازہ اوپر کے اقتباس سے ہورہا ہے۔ ضرورت تھی کہ اتنے اہم واقعہ کو خالص واقعاتی اور تاریخی انداز میں بیان کیا جائے تاکہ اس کا بھرپور فائدہ حاصل ہوسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان جب تک شاعروں اور ادیبوں کے سحر سے باہر نہیں آئیں گے، ان کی زبان جدید معیار کے مطابق ترقی نہیں کرسکتی۔

میگزین میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر نقل کی گئی تھی۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ دوسری عالمی جنگ کے موقع پر میری یہ قطعی رائے تھی جس پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبران کی اکثریت کو اتفاق تھا کہ اگر برطانیہ یہ مان لے کہ جنگ کے بعد ہندستان کو آزادی دے دی جائے گی تو ہم لڑائی میں شریک ہوسکتے ہیں۔ گاندھی جی کو اس سے سخت اختلاف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم ایسی آزادی لینا ہی نہیں چاہتے جو لڑائی کے سایہ میں ہم کو ملے۔ اس لیے وہ کسی طرح بھی لڑائی میں شرکت کے لیے تیار نہ تھے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجاویز کا ڈرافٹ گاندھی جی ہی بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اپنے اس رزولیوشن کا ڈرافٹ بنوانے کے لیے میں اور پنڈت نہرو گاندھی جی کے پاس گئے۔ انھوں نے اپنے پورے اختلاف کے باوجود اس تجویز کا ڈرافٹ بنادیا۔

اسی کا نام اختلاف کے باوجود احترام کرنا ہے۔ اور کوئی بڑا کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جن میں ایک دوسرے کے بارہ میں یہ اعلیٰ اخلاقی صفت پائی جائے۔

میلہ نوچندی میگزین میں میرٹھ کی بہت سی شخصیتوں کا تعارف تھا۔ ان میں سے ایک عجیب قصہ یہ تھا کہ ہردواری لال تیاگی یہاں کے ایک سیدھے سادے آدمی تھے، تحریک آزادی میں انھوں نے موثر حصہ لیا تھا۔ آزادی کے بعد انھوں نے گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ ایک دن یہ کہہ کر کہ زیادتی عمر میں اب زندہ رہنا ملک و قوم پر ایک بوجھ ہے، کمر سے اینٹیں باندھ کر اپنے گھر کے کنویں میں گر گئے۔ تاہم میگزین میں اس واقعہ کی کوئی تاریخ درج نہیں تھی۔

میرٹھ کے محمد یامین صاحب پرانے کانگریسی رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی میں ۱۹۴۹ میں جب اجودھیا کی بابری مسجد میں مورتیاں رکھ دی گئیں اور پھر عدالت کے حکم سے مسجد میں تالا لگا دیا گیا تو مولانا آزاد نے کچھ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ " بابری مسجد کے مسئلہ کو عدالت کے ذریعہ طے کرایا جانا چاہیے، اس کو سڑکوں پر لانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا "

مولانا آزاد کا یہ مشورہ نہایت صحیح تھا۔ مگر اسی کے ساتھ مولانا آزاد کو جاننا چاہیے تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت نہایت جذباتی ہے۔ کوئی بھی غیر ذمہ دار لیڈر جذباتی تقریریں کر کے انھیں سڑکوں پر لا سکتا ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ فکر و شعور میں اصلاح کی ایک مستقل مہم چلا کر مسلمانوں کو حقیقت پسند بنایا جائے تاکہ مفاد پرست افراد جھوٹے الفاظ بول کر انھیں گمراہ نہ کر سکیں۔ مگر مولانا آزاد یا ان کے ساتھیوں نے تعمیر شعور کی یہ مہم نہیں چلائی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مشورہ ہندستانی مسلمانوں کی عملی پالیسی نہ بن سکا۔

مولانا آزاد کا مشورہ اصولی طور پر بالکل درست تھا۔ ۱۹۴۷ کے بعد اسی ملک میں بہت سی ناجائز قبضہ والی مسجدوں کو عدالت کے ذریعہ واگزار کرانے میں کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ پھر بابری مسجد کے معاملہ میں ناکامی کیوں ہوئی، اس کا سبب دراصل اسی فطری طریقہ سے انحراف تھا۔

بابری مسجد کا مسئلہ بھی عدالت میں زیر سماعت تھا۔ مگر اسی کے ساتھ کچھ سطحی لیڈر اس کو سڑکوں پر نکال لائے۔ ابتداءً یہ مسئلہ ایک قصبہ کے کچھ ہندوؤں اور کچھ مسلمانوں کا مسئلہ تھا۔ مگر جب اس کو نعروں اور جلسوں کی دھوم مچا کر پورے ملک کا مسئلہ بنایا گیا تو وہ پورے ملک کی ہندو اکثریت اور

مسلم اقلیت کا مسئلہ بن گیا۔ اس طرح اس مسئلہ کی نزاکت غیر متناسب طور پر بہت زیادہ بڑھ گئی۔ نااہل مسلم لیڈروں کی یہی بدترین نادانی ہے جس نے وہ حالات پیدا کیے جب کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو ایک بپھرا ہوا مجمع اجودھیا میں داخل ہو جائے اور وہ بابری مسجد کو توڑ ڈالے۔

اس علاقہ میں خورجہ کے پاس ایک گاؤں ہے۔ اس کا نام جاچاہ ہے۔ یہاں ایک سید ظل حسنین رضوی تھے۔ ان کا خاندان تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا۔ پاکستان بننے سے چند دن پہلے ان کے چھوٹے بھائی جاچاہ سے دہلی گئے اور وہاں سے ایک گراموفون خرید لائے۔ ان کی والدہ اس پر بہت خفا ہوئیں، انھوں نے کہا کہ لوگ تو گھر بار چھوڑ کر پاکستان جا رہے ہیں اور تم گراموفون خرید لائے ہو۔ بھائی نے کہا کہ ہم لوگ جب پاکستان جائیں گے تو اس کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ والدہ نے بگڑ کر کہا کہ پاکستان تو پاک جگہ ہے۔ وہاں کیا گراموفون بجائے جائیں گے وہاں تو ہر طرف اللہ اللہ ہوا کرے گا۔

ایک عام مسلمان کے ذہن میں اس وقت پاکستان کا یہی تصور تھا۔ کیوں کہ مسلم لیگ نے ہر طرف یہ شور برپا کر رکھا تھا: پاکستان کا مطلب کیا، لاالٰہ الا اللہ مگر عملاً اس کے برعکس ہوا۔ موجودہ پاکستان میں اللہ کے نغمے گم ہو گئے۔ ہر طرف بس غیر اللہ کے ہنگامے جاری ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے۔

لاہور کے پروفیسر محمد اسلم جنھوں نے اپنے پڑوسی سید ظل حسنین رضوی سے سن کر یہ قصہ لکھا ہے۔ وہ پاکستانی تحریک کے اس برعکس انجام کی توجیہہ اس طرح کرتے ہیں:

"ہوا یوں کہ قیام پاکستان کے موقع پر ایک اسپشل ٹرین مرکزی حکومت کے مسلم افسروں کو لینے کے لیے دہلی بھیجی گئی۔ جب وہ ٹرین وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ مسلم آفیسرز بذریعہ ہوائی جہاز کراچی روانہ ہو چکے ہیں۔ ٹرین کے منتظمین نے کراچی سے رابطہ قائم کیا تو وہاں سے جواب ملا کہ زیڈ اے بخاری (م ۱۹۷۵) ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کی یہ دلی خواہش ہے کہ وہ ٹرین خالی واپس لانے کے بجائے دہلی اور یوپی سے موسیقاروں، میراثیوں، طبلہ نوازوں، طوائفوں اور ربابیوں کو پاکستان لے آئے۔ چنانچہ بخاری صاحب کی خواہش پر اس ٹرین میں یہ فن کار پاکستان تشریف لے آئے۔ اور پھر انھوں نے وہ اودھم مچایا کہ الامان والحفیظ۔ سید ظل حسنین رضوی کی والدہ

پاکستان میں جو پاکیزہ آوازیں سننا چاہتی تھیں وہ طبلوں کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار میں دب کر رہ گئیں (سفرنامہ ہند، مطبوعہ لاہور ۱۹۹۵، صفحہ ۵۱۵)

کیسی عجیب بات ہے کہ جس پاکستان کو مفکر اعظم علامہ اقبال نے سوچا اور اس کو ملّت اسلامیہ ہند کے مسائل کا حل بتایا۔ اور جس کو قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنی تمام مہارت استعمال کر کے بنوایا، وہ خود بانیٔ پاکستان کی زندگی ہی میں اتنا کمزور نکلا کہ چند غیر معروف فن کاروں نے اس کو بالکل تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ یہ واقعہ زیڈ اے بخاری کی شخصیت کو داغدار نہیں کرتا بلکہ وہ خود مفکر اعظم کی فکر اور قائد اعظم کی قیادت کو مشتبہ قرار دے رہا ہے۔

عوام اور رہنما میں یہ فرق ہے کہ عوام آج کو دیکھتے ہیں اور رہنما کل کو دیکھتا ہے۔ عوام صرف ان باتوں کو جانتے ہیں جن کے درمیان وہ بروقت گھرے ہوئے ہیں۔ اور رہنما اپنی برتر صلاحیت کی بنا پر ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ وہ حالات سے اوپر اٹھ کر وسیع تر دنیا کو دیکھ سکے۔ عوام چیزوں کو صرف اپنی پیشانی کی نظروں سے دیکھ پاتے ہیں۔ مگر جو رہنما ہے اس کی بصیرت اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ جن چیزوں کو عام لوگ دیکھ نہیں پاتے ان کو بھی وہ اپنی اندرونی نگاہ سے جان لیتا ہے۔

اسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ رہنما کے عمل کو حال کے اعتبار سے نہیں بلکہ مستقبل کے اعتبار سے جانچا جاتا ہے۔ یہ دراصل بعد کو پیش آنے والے حالات ہیں جو بتاتے ہیں کہ رہنمائی درست تھی یا نہیں۔

سماجی یا قومی زندگی میں جب کوئی اقدام کیا جاتا ہے تو وہ اقدام اگرچہ حال میں کیا ہوا عمل ہوتا ہے مگر اس کا نتیجہ ہمیشہ مستقبل میں نکلتا ہے۔ اس لیے کسی اقدام کی صحت کو جانچنے کا معیار مستقبل ہے نہ کہ حال۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی سب باتیں ٹھیک ہیں مگر آپ کو کسی کے اوپر تنقید نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ یہ بات آپ اپنی عقل سے کہہ رہے ہیں، مگر قرآن وحدیث میں اس کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں۔ اسلام کے دور اول میں تنقید عام تھی اور کوئی برا نہیں مانتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تنقید کو برا ماننا قومی زوال کی علامت ہے، اور تنقید کو خوش دلی کے ساتھ سننا قومی عروج کی علامت۔

حدیث میں آیا ہے کہ : المؤمنُ مِرآۃُ المؤمنِ (سنن ابی داؤد ۴/۲۸۱) یعنی ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہے ۔ دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اِنّ الدین النصیحۃ (۲۸۸) یعنی دین نصیحت ہے ۔

ایک آدمی کے اندر جب اسلام کی سچی اسپرٹ پیدا ہوتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کا خیر خواہ بن جاتا ہے ۔ اسی خیر خواہی کا نام نصیحت ہے ۔ اس خیر خواہی کی مختلف صورتیں ہیں ۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ دوسروں کے لیے آئینہ کی مانند ہو جائے ، وہ دوسروں کو ان کی واقعی حیثیت سے آگاہ کرتا رہے ۔

دوسروں کو فہمائش کرنا اگر دوسروں کو کمتر دکھانے کے لیے ہو اور اس لیے ہو کہ دوسروں کے اوپر اپنی برتری ظاہر کی جائے تو یہ ایک گناہ کا فعل ہے اور اس پر خدا کی طرف سے سخت پکڑ کا اندیشہ ہے ۔ اس کے بجائے اگر فہمائش کا مقصد دوسرے کی خیر خواہی اور سچی اصلاح ہو تو یہ ایک عظیم ثواب کا کام ہے ۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو ڈاکٹر رفیق ذکریا کی انگریزی کتاب "بڑھتی ہوئی تفریق" پڑھے ہوئے تھے ۔ یہ کتاب ۱۹۹۵ میں پنگوئن بکس انڈیا کی طرف سے چھپی ہے :

The Widening Divide
An insight into Hindu-Muslim relations

انھوں نے کہا کہ مصنف نے اس کتاب میں آپ کی بابت یہ لکھا ہے کہ آر ایس ایس کے ساتھ آپ کا قریبی ربط (close association) ہے اور اس بنا پر آپ مسلمانوں کے درمیان ایک مشتبہ شخصیت بن گئے ہیں (صفحہ ۲۷۵) انھوں نے کہا کہ میں آپ کا الرسالہ پڑھتا ہوں مگر اس میں آپ نے اس تبصرہ کی بابت کچھ نہیں لکھا ۔

میں نے کہا کہ یہ ایک نہایت سطحی تبصرہ ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں کے معیار کو بتاتا ہے ۔ آپ دیکھئے ۔ اس کتاب کو انھوں نے نام لیے بغیر مہاتما گاندھی (اور نہرو) کے نام ڈیڈیکیٹ کیا ہے ۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ انھوں نے ہندو مسلم یونیٹی کے لیے بہت کام کیا ۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بھی اسی ہندو مسلم اتحاد کے لیے کام کر رہا ہوں ۔ مگر عین اسی کام

کے کرنے پر انھوں نے مجھ کو یہ انعام دیا کہ مجھ کو آر ایس ایس کے ساتھ بریکٹ کر دیا۔

یہ کیسا عجیب تضاد ہے کہ گاندھی اگر ہندو مسلم اتحاد کے لیے مسلمانوں سے ملیں تو وہ قابل تعریف ہیں۔ اور میں اگر اسی اتحاد کی خاطر ہندوؤں کے مختلف طبقات سے ملوں تو مجھ کو ایک بدنام جماعت کے ساتھ وابستہ کر کے مجھے ایک مشتبہ شخصیت ظاہر کیا جائے۔ میں نے کہا کہ یہی آج تمام دانشوروں کا حال ہے۔ کیا ایسی پست دانشوری سے لوگوں کو کوئی صحیح اور مثبت رہ نمائی مل سکتی ہے۔

ایک صاحب نے پوچھا کہ دعوت فرض عین ہے یا فرض کفایہ۔ میں نے کہا کہ دعوت فرض عین ہے یا فرض کفایہ، یہ ایک قانونی اور منطقی سوال ہے۔ زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ دعوت سب سے بڑا ثواب کا کام ہے۔ آدمی کی یہ فطرت ہے کہ جس چیز میں زیادہ نفع ہو ادھر وہ فوراً دوڑتا ہے، اس کے بارہ میں قانونی بحثیں نہیں کرتا۔ پھر دعوت ہی کے معاملہ میں آپ کیوں اس قسم کے فنی اور قانونی سوالات اٹھا رہے ہیں۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ حکومت واقتدار اسلام میں مطلوب نہیں ہے بلکہ موعود ہے۔ وہ عالم تھے، اس لیے سمجھ گئے کہ میرا اشارہ قرآن کی آیت (النور ۵۵) کی طرف ہے۔ مگر جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے: وکان الانسان اکثر شیئ جدلا، انھوں نے فوراً ہی اس کی تردید کے لیے ایک لفظ پالیا۔ انھوں نے کہا: حکومت اگر مطلوب نہیں ہے تو متروک بھی تو نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ حکومت جب مطلوب شئے نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اسلامی تحریک کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اور جو چیز نشانۂ تحریک نہ بن سکے وہ اس اعتبار سے متروک ہی قرار پائے گی۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ دور میں بہت سے نئے فتنے اٹھے۔ مثلاً انکار حدیث کا فتنہ، نئی نبوت کا فتنہ، وغیرہ۔ مگر میرے نزدیک دور جدید کا سب سے بڑا فتنہ وہ ہے جس کو "مکمل اسلام" کہا جاتا ہے۔ بقیہ تمام فتنے ننگے فتنے تھے، اس لیے ان کو پہچاننا آسان تھا۔ مگر وہ فتنہ جو "مکمل اسلام قائم کرو" کے نعرہ کے ساتھ اٹھا وہ ایک نقاب پوش فتنہ تھا۔

چنانچہ بہت سے علما تک اس کے سحر میں مبتلا ہو گئے۔

نام نہاد مکمل اسلام نے موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ دینی نقصان پہنچایا ہے۔ اسلام میں سارا فوکس تقویٰ پر ہے۔ مگر اس نظریہ نے سارا فوکس سیاست کی طرف کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو اندر سے بالکل خالی تھے مگر بیرونی طور پر وہ سیاسی الفاظ کا جنگل بنے ہوئے تھے۔

مکمل اسلام کے اس نظریہ نے تمام مسلم ملکوں میں مسلمانوں کو حکمراں اور غیر حکمراں طبقہ میں بانٹ کر انھیں ایک دوسرے کے خلاف لڑا دیا۔ اس کے نتیجہ میں مسلم ملکوں کے بہترین مواقع برباد ہو کر رہ گئے۔

پھر اسلام کی یہ سیاسی تعبیر اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا عمل غیر مسلموں کو اسلام سے بھڑکانے کا سبب بن گیا۔ انھوں نے سمجھا کہ اسلام کوئی جنگ جو مذہب ہے جو ساری دنیا کے خلاف لڑائی کر کے انھیں محکوم بنانا چاہتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کی اشاعت کے نہایت قیمتی مواقع کھلے تھے۔ مگر سیاسی اسلام پسندوں کی متشددانہ کارروائیوں نے تمام مواقع کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

علمی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ لوگ وہی غلطی کر رہے ہیں جس کو تقابل کی غلطی کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کو ماننے والے اپنے مکمل اسلام کا تقابل جزئی اسلام سے کرتے ہیں۔ حالاں کہ اس معاملہ میں یہ تقابل نہیں ہے، یہاں جو تقابل ہے وہ فروعی اسلام اور اساسی اسلام میں ہے۔ مکمل اسلام کے نام پر یہ لوگ دراصل فروعی اسلام کو لے رہے ہیں اور اساسی اسلام کو چھوڑ رہے ہیں۔ اور جب اساسی اسلام چھوٹ جائے تو صرف ایک ظاہری دھوم باقی رہے گی، وہاں صحیح معنوں میں نہ اساسات باقی رہیں گے اور نہ فروع۔

ایران کی دار السلطنت تہران میں تنظیم اسلامی کانفرنس (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس) کا سہ روزہ اجلاس ۱۲ دسمبر ۱۹۹۷ کو مکمل ہوا۔ اس کانفرنس میں ۵۵ اسلامی ملکوں کے سرکاری نمائندے شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کے اعلانیہ (تہران ڈکلریشن) پر ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ اس ڈکلریشن میں اسلام کے نام پر ہونے

والے تشدد کی کھلی مذمت کی گئی ہے۔

میں نے کہا کہ مگر مجھے اس پر کوئی خوشی نہیں۔ کیونکہ اصل مسئلہ تشدد کے خاتمہ کا ہے اور وہ اس اعلانیہ کے باوجود ختم ہونے والا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اعلانیہ میں تشدد کی جو مذمت کی گئی ہے وہ مجہول انداز میں ہے، وہ متعین انداز میں نہیں۔ اور غیر متعین اور غیر مشخص مذمت کا عملی طور پر کوئی فائدہ نہیں۔

میں نے کہا کہ اسلام میں جنگ صرف منظم حکومت کے لیے جائز ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے غیر حکومتی سطح پر جہاد کے نام سے جو لڑائیاں جاری کر رکھی ہیں وہ صرف فساد ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک اردو اخبار کے ایڈیٹر نے کہا کہ آپ مسلم لیڈروں پر تنقید کرتے ہیں مگر آپ ہندو لیڈروں پر تنقید نہیں کرتے۔ اس کا راز کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا راز آپ کی بے خبری ہے۔ آپ نے شاید میری کچھ چیزیں پڑھی ہیں اور بہت سی دوسری چیزیں آپ نے نہیں پڑھیں اس لیے آپ کو یہ غلط فہمی ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھ کو کسی بھی شخص یا کسی بھی فرقہ سے کوئی عداوت نہیں۔ میرے دل میں سب کے لیے یکساں طور پر خیر خواہی کا جذبہ ہے۔ میرا یہی خیر خواہی کا جذبہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ قوم یا انسانیت کے لیے جہاں کہیں کوئی قابلِ اصلاح بات دیکھوں، دلائل کی روشنی میں اس کی وضاحت کروں۔

اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ عام ہندو لیڈر تو درکنار، میں نے اس ملک کی اس سب سے بڑی شخصیت پر تنقید کی ہے، جس کو فادر آف دی نیشن کا درجہ حاصل ہے۔ اور جس پر کھلی تنقید کرنے کی ہمت پچھلے پچاس سال سے نہ کسی ہندو کو ہوئی اور نہ کسی مسلمان کو۔ یہ مہاتما گاندھی کی شخصیت ہے۔

میری اس بات کے ثبوت کے لیے آپ انگریزی روزنامہ پانیر کا شمارہ ۲۶ جنوری ۱۹۹۷ دیکھ سکتے ہیں۔ میری یہ تنقید اتنی خلافِ توقع تھی کہ امریکہ کے مشہور اخبار نیویارک ٹائمز نے اپنے شمارہ ۳۱ جنوری ۱۹۹۷ میں اس کا خلاصہ شائع کیا۔

اخبار پانیر کے زیر انتظام نئی دہلی میں ایک خصوصی جلسہ ہوا۔ اس میں دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ کیا گاندھی آج کے انڈیا میں کامیاب ہو سکتے تھے:

اس جلسہ کے پانچ مقررین میں سے ایک میں تھا۔ بقیہ کے نام یہ ہیں : رام چندر گاندھی، راوندر کمار، سوبرت مکھرجی، کے آر ملکانی۔ اس ڈسکشن میں لوگوں نے جو کچھ کہا وہ پانیر کے مذکورہ شمارہ میں مکمل طور پر شائع ہو چکا ہے۔ آپ اس کو اس میں دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے جو کچھ کہا وہ بھی اس میں مکمل طور پر چھپا ہوا موجود ہے۔ میں نے اس موقع پر جو بات کہی تھی اسی کو اخبار نے اس رپورٹ کا عنوان بنایا ہے جو یہ ہے —— گاندھی نے ایک پُرامن کُو کی قیادت کی۔ وہ کوئی ریولیوشن نہیں لائے :

He presided over a non-violent coup, he didn't usher in a revolution.

میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ تبدیلی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کو انگریزی میں کُو کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک حکمراں کو ہٹا کر دوسرے حکمراں کو اس کی جگہ بٹھا دینا، بغیر اس کے کہ عمومی زندگی میں کوئی انقلاب آیا ہو۔ دوسری تبدیلی وہ ہے جس کو ریولیوشن کہا جاتا ہے۔ یہ وہ تبدیلی ہے جس میں افراد کا کیریکٹر، سماجی اداروں کے حالات اور پورا سسٹم بدل کر کچھ سے کچھ ہو جائے۔ اس تقسیم کے مطابق مہاتما گاندھی جو چیز لائے وہ ایک کُو تھا نہ کہ ریولیوشن۔

اپنی اس رائے کے حق میں تفصیلی دلائل دیتے ہوئے میں نے کئی باتیں کہیں۔ مثلاً میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے اپنی سوچ کے تحت برٹش راج کو تمام خرابیوں کی جڑ سمجھ لیا۔ ان کا خیال تھا کہ جب انگریزوں کا اقتدار ختم ہوگا اور حکومت ملکی لیڈروں کے ہاتھ میں آجائے گی تو تمام معاملات اپنے آپ درست ہو جائیں گے۔ مگر یہ ایک معصومانہ سوچ ہے کسی ملک یا سماج کے حالات اس کے افراد کے اندر تعمیری شعور جگانے سے آتے ہیں نہ کہ محض حکومتی افراد کے بدلنے سے۔

ایک ہندو پروفیسر میری باتیں سن کر کسی قدر غصہ ہو گئے۔ انھوں نے شدید لہجہ میں کہا کہ آپ گاندھی پر تنقید کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں۔ میرے دل میں گاندھی کی محبت ہے، مگر میرے دل میں اپنے ملک کی محبت اس سے بھی زیادہ ہے :

I love Gandhi, but I love India more than Gandhi.

پھر میں نے کہا کہ یہ تنقید بے حد ضروری ہے۔ کیوں کہ آج بھی لوگ اسی ناکام سیاسی فارمولا کو بار بار دُہرا رہے ہیں۔ مثلاً جے پرکاش نارائن نے اسی ذہن کے تحت یہ سمجھ لیا کہ کانگریس راج ملک کی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ کانگریس راج کو اگر ختم کر دیا جائے تو یہاں مکمل انقلاب (ٹوٹل ریولیشن) آجائے گا۔ اس نظریہ کے تحت انھوں نے زبردست سیاسی دھوم برپا کی، یہاں تک کہ ۱۹۷۷ء میں کانگریس پارٹی کا اقتدار ختم ہو کر جنتا پارٹی کا اقتدار قائم ہو گیا۔ مگر حقیقی حالات میں کچھ بھی اصلاح یا تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم سارے معاملہ پر ازسرِنو غور کریں۔ تاکہ نیا ہندستان بنانے کے لیے نتیجہ خیز عمل کیا جا سکے۔

سوئزرلینڈ کے اخبار لے جرنل دے جنیوا کے نمائندہ مسٹر ریجس نس بوم (Regis Nusbaum) نے ۱۸ جون ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر پچھلے پچاس سالوں کے اندر ہندستانی مسلمانوں کے حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے ترقی کے وہی تمام مواقع موجود ہیں جو کسی بھی دوسرے ملک میں ہو سکتے ہیں۔ تاہم مسلمان ان مواقع کو بخوبی طور پر استعمال نہ کر سکے۔ اس کی واحد وجہ خود مسلمانوں کی نا اہل قیادت ہے۔ تاہم مسلمان اب جاگ اٹھے ہیں، اور انھوں نے نئے شعور کے تحت ان مواقع کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

بی بی سی کی ٹی وی ٹیم نے ۸ جولائی ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ کسی بھی گروہ کے لیے عدم تحفظ کا مسئلہ خارج سے نہیں بلکہ داخل سے ہوتا ہے۔ گروہ کے اندر اگر داخلی استحکام ہو اور وہ ہوش مندی کے ساتھ زندگی گزارنا جانے تو اس کے لیے کسی بھی مقام پر عدم تحفظ کا کوئی سوال نہیں۔

آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کے تحت ایک پینل ڈسکشن ہوا جو ۱۸ جولائی ۱۹۹۷ کو براڈکاسٹ کیا گیا۔ اس کا موضوع تھا: سیرتِ نبویؐ اور امن عالم کا مسئلہ۔ صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔ یہ بتایا گیا کہ امن کا قیام اسلام کا اولین مطلوب ہے، کیونکہ امن کے بغیر کوئی مثبت کام نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا طریقِ کار پر امن طریقِ کار ہے۔ متشددانہ طریقِ کار سراسر اسلام کے خلاف ہے۔

انگریزی ہفتہ وار آوٹ لک (Outlook) کے نمائندے مسز سوما ودھوا اور مسٹر پراشنت پنجیار نے ۲۲ جولائی ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستان کے پچھلے پچاس سال کے حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کی سیاسی قیادت اگرچہ ناکام ہو گئی ہے لیکن انٹلکچول قیادت تیزی سے ابھر رہی ہے اور مسلمانوں کا تعمیری مستقبل بنانے میں مصروف ہے۔ موجودہ حالات میں یہ ایک امید افزا صورت حال ہے۔

۵- ۵ اگست ۱۹۹۷ کو آل انڈیا ریڈیو کی نئی دہلی کی ٹیم نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر آزادی کے بعد کے ہندستان میں سدبھاؤنا کے مسئلہ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مل جل کر رہنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اگر انسان کو اپنی حالت پر رہنے دیا جائے تو فطرت کی رہنمائی میں اپنے آپ وہ مل جل کر رہتا ہے۔ مگر ہمارے ملک میں دو اسباب سے فطرت کے اس نظام میں خلل پیدا ہوا ہے۔ ایک، اخبارات کی یک طرفہ رپورٹنگ۔ دوسرے، لیڈروں کی جذباتی سیاست۔

۶- ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کی نمائندہ مسز فرحت رضوی نے ۸ اگست ۱۹۹۷ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستان کے حال اور مستقبل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان کے مستقبل کی تعمیر کے لیے واحد نکاتی فارمولا ایجوکیشن ہے۔ اگر ملک میں تعلیم عام ہو جائے تو اس کے تمام مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

۷- ہندی روزنامہ جن ستّا کے نمائندہ مسٹر طاہر نے ۸ اگست ۱۹۹۷ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق پچھلے پچاس سالہ ہندستان سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان کی مصیبت دو چیز ہے۔ اخبار اور نیتا۔ یہ دونوں کے دونوں منفی رول ادا کر رہے ہیں۔ اگر یہ دونوں مثبت رول ادا کریں تو دیش کے سارے معاملات اپنے آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔

۸- بی بی سی کے نمائندہ مسٹر شکیل اختر نے ۱۲ اگست ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر پچھلے ۵۰ سال کے دوران ہندستانی مسلمانوں کے حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ۱۹۴۷ کے بعد ملکی لیڈروں نے سیکولرزم کو اختیار کیا۔ یہ بہت صحیح فیصلہ تھا۔ اس فیصلہ کی وجہ سے مسلمانوں کو غیر معمولی فائدے حاصل ہوئے۔

۹- انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، نئی دہلی میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایکولوجی کی طرف سے ۱۷ اگست ۱۹۹۷ کو ایک نیشنل سمپوزیم ہوا۔ اس کا عنوان تھا: اگلے پچاس سال کے لیے انڈیا کا ایجنڈا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمارے لیے مستقبل کا واحد نکاتی فارمولا ایجوکیشن ہے۔

۱۰- سیرین میڈیا کے نمائندہ ڈاکٹر وائل الشیخ حسن عواد نے ۱۱ اگست ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا ٹی وی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل حقیقۃً چیلنج ہیں۔ چیلنج زندگی کا حصہ ہے جو ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ اس لیے میں ان مسائل کو ترقی کا زینہ سمجھتا ہوں۔ ہندستانی مسلمانوں نے ۱۹۴۷ کے بعد بہت زیادہ ترقی کی ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ وہ ترقی کریں گے۔

۱۱- ایک دعوتی پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز نے سلطنت عمان کا سفر کیا۔ یہ سفر ۲۱ اگست ۱۹۹۷ سے لے کر ۴ ستمبر تک جاری رہا۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۱۲- اسٹیٹسمین (دہلی) کے نمائندہ مسٹر ضیاء السلام نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس کا موضوع اسلام میں عورتوں کے حقوق تھا۔ یہ انٹرویو اسٹیٹسمین کے شمارہ ۱۹ ستمبر ۱۹۹۷ میں شائع ہوا ہے۔

۱۳- کرپال باغ (نئی دہلی) میں ۲۰ ستمبر ۱۹۹۷ کو ایک جلسہ ہوا۔ یہ روحانیت کے موضوع پر ایک عالمی کانفرنس تھی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام اور روحانیت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۱۴- جین مہا سبھا کی طرف سے نئی دہلی میں ۲۱ ستمبر ۱۹۹۷ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کی صدارت ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے کی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور امن اور اتحاد کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۱۵- نئی دہلی کے نہرو اسٹیڈیم میں ایک ہفتہ کے لیے ہیلتھ میلہ لگایا گیا۔ اس موقع پر ۲۶ ستمبر ۱۹۹۷ کو یہاں جمعہ کی نماز ادا کی گئی۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور جمعہ کے بعد نماز کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۱۶- ۲۸ ستمبر ۱۹۹۷ کو دوردرشن کی ٹی وی ٹیم مرکز میں آئی۔ اس نے صدر اسلامی مرکز کی پوری زندگی کے بارہ میں تفصیلی پروفائل تیار کیا۔ اس میں بچپن اور تعلیم سے لے کر موجودہ الرسالہ مشن تک ہر چیز کے بارہ میں سوال و جواب تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مذہب کے

بارے میں بنیادی طور پر دو تصور ہیں۔ ایک وحدت الوجود اور دوسرے توحید۔ وحدت الوجود کے نظریہ کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک صحیح مذہبی نظریہ وہی ہے جس کو اسلام میں توحید کہا گیا ہے۔

۱۷۔ ۶ - ۷ اکتوبر ۱۹۹۷ کو وینس (اٹلی) میں امن کے موضوع پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع سے متعلق ایک مقالہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور اسلام میں امن اور انسانیت اور روحانیت کے تصور کو واضح کیا۔

۱۸۔ تل ابیب (فلسطین) میں امن عالم کے موضوع پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس ۱۹ - ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۷ کو ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور امن (پیس) کے موضوع پر ایک پیپر پیش کیا۔ یہ پیپر ان شاء اللہ الرسالہ انگریزی میں شائع کر دیا جائے گا۔ اس سفر میں انھوں نے مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کی بھی زیارت کی۔

۱۹۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۹۷ کو گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو صاحبان شریک ہوئے۔ اس کا انتظام سوادھیائے کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور ملک کے موجودہ حالات پر اظہار خیال کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان میں سیاسی عدم استحکام کا مسئلہ بظاہر نامعلوم مدت تک کے لیے پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اگر ملک میں سماجی سطح پر استحکام کی حالت پیدا ہو جائے تو سیاسی اُدل بدل کے باوجود ملک ترقی کرتا رہے گا۔ جیسا کہ مثال کے طور پر اٹلی میں ہے۔ اور خود ہندستان میں زرعی دور میں تھا۔

۲۰۔ گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) میں ۴ نومبر ۱۹۹۷ کو ایک آل انڈیا سمپوزیم ہوا۔ اس کا موضوع سرودیہ الائنس تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور صدر جلسہ کی حیثیت سے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم لوگوں کو چاہیے کہ حکومت کے خلاف احتجاج کرنے کے بجائے غیر سیاسی میدان میں سماجی تعمیر کا کام کریں۔ اگر مستحکم سماج بن جائے تو سیاسی اُدل بدل کے باوجود ملک ترقی کرتا رہے گا۔

۲۱- ۵ نومبر ۱۹۹۷ کو دور درشن کی ٹیم نے صدر اسلامی مرکز کا ایک ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع ''گاندھی اور نیا ہندستان'' تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ گاندھی کا نان وائلنس کا اصول فطرت کا ایک اصول ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر ہندستانی سماج کی نئی تعمیر کی جاسکتی ہے۔

۲۲- ٹی وی ٹوڈے (نئی دہلی) نے ۸ نومبر ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ عورت اور مرد کو اسلام میں کیا درجہ دیا گیا ہے۔ بتایا گیا کہ اسلام میں عورت اور مرد دونوں کو برابر کا درجہ حاصل ہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسجدوں میں نماز کے لیے عورتوں کو اجازت ہے۔ مگر اپنی گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے وہ زیادہ نہیں جاسکتی ہیں، اس لیے مسجد میں جانا ان کے لیے لازمی نہیں قرار دیا گیا ہے۔

۲۳- جین سماج (آچاریہ تلسی گروپ) کی طرف سے ۷ نومبر ۱۹۹۷ کو راج گھاٹ نئی دہلی میں ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع ملک میں بڑھتا ہوا بھرشٹا چار اور اس کا حل تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس جلسہ میں شرکت کی اور موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے اظہار خیال کیا۔

۲۴- نینی تال کے اَمتُل پبلک اسکول کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے نینی تال کا سفر کیا۔ وہاں دو بڑے پروگراموں میں خطاب کیا اور بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ یہ سفر ۱۲-۱۴ نومبر ۱۹۹۷ کو ہوا۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے ساتھ شائع کر دی جائے گی۔

۲۵- ادھیاتمک سادھنا کیندر (مہرولی، دہلی) میں ۱۶ نومبر ۱۹۹۷ کو دگمبر جین کی طرف سے ایک جلسہ تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور روحانیت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۲۶- گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ۱۶ نومبر ۱۹۹۷ کو تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس کا موضوع تھا: آئیڈیل اور پریکٹکل کا درجہ اسلام میں۔ اس موضوع پر صدر اسلامی مرکز نے ایک تقریر کی اور قرآن و حدیث کی روشنی میں اس موضوع کی وضاحت کی۔ اس تقریر کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

اُردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	55/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دین کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہورِ اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاءِ اسلام	35/-
رازِ حیات	65/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4/-
منزل کی طرف	2/-
فکرِ اسلامی	50/-
طلاق اسلام میں	3/-
دین انسانیت	60/-

شتمِ رسول کا مسئلہ	40/-
مطالعۂ سیرت	—
ڈائری جلد اول	80/-
کتابِ زندگی	55/-
انوارِ حکمت	—
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	25/-
عقلیاتِ اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	—
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	7/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	8/-
پیغمبرِ اسلامؐ	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	—
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
امہات المومنین	20/-
تصویرِ ملت	85/-
دعوتِ اسلام	50/-
دعوتِ حق	40/-
نشری تقریریں	65/-

اسفارِ ہند	—
اسلام ایک تعارف	—
حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامینِ اسلام	—
تعددِ ازواج	7/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	—
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	—
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8/-
الاسلام یتحدیٰ (عربی)	85/-
یکساں سول کوڈ	5/-
اسلام کیا ہے	8/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	—
آخری سفر	8/-
اسلام کا پرتیچے	8/-
پیغمبرِ اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بھوتِنی واد اور اسلام	7/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوش	8/-
پوترجیون	8/-

A Treasury of the Qur'an	75.00
Words of the Prophet Muhammad	85.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	—
An Islamic Treasury of Virtues	—
The Life of the Prophet Muhammad	75.00
Sayings of Muhammad	85.00
The Beautiful Commands of Allah	125.00
The Beautiful Promises of Allah	175.00
The Soul of the Qur'an	125.00
The Wonderful Universe of Allah	95.00
Presenting the Qur'an	165.00
The Muslim Prayer Companion	—
Indian Muslims	65.00
Islam and Modern Challenges	95.00
Islam: The Voice of Human Nature	30.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	95.00
Woman in Islamic Shari'ah	65.00
Islam As It Is	55.00
Religion and Science	45.00
The Way to Find God	20.00
The Teachings of Islam	25.00
The Good Life	20.00
The Garden of Paradise	25.00
The Fire of Hell	25.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
Uniform Civil Code	10.00